غزلیات مومن کا تجزیہ

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

غزلیات مومن کا تجزیہ

ترتیب

ڈاکٹر عقیل احمد

غزلیات مومن کا تجزیہ

ترتیب

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

غالــــب اکیڈمــی

Ghazaliat-e-Momin ka Tajzia
by
Dr. Aqil Ahmad

نام کتاب : غزلیات مومن کا تجزیہ
ترتیب : ڈاکٹر عقیل احمد
اشاعت اول : جنوری 2016
ناشر : غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی 13
قیمت : 150/-
طباعت : شیراونی آرٹ پرنٹرس 1480 گلی حکیم اجمل خاں، بلیماران، دہلی

☆☆☆

ISBN:978-93-83353-06-4

فہرست

سدابہار

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

☆

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

☆

سامنے سے جب وہ شوخ دل ربا آجائے ہے
تھام ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

☆

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

☆

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ابتدائیہ

مومن کی پیدائش دہلی کے کوچہ چیلان میں سن 1800 عیسوی میں ہوئی۔ ان کے دادا نامدار خاں اور ان کے بھائی حکیم کامدار خاں مومن کے پیدائش سے تقریباً چالیس سال پہلے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ دونوں بھائی تجربہ کار طبیب تھے۔ کشمیر میں ان کے فن کی بہت زیادہ قدر نہیں ہو رہی تھی۔ دہلی چوں کہ دارالخلافہ تھی اس لیے وہ دہلی آ گئے۔ شاہ عالم نے انھیں جاگیر عطا کی۔ ان کی جاگیر کو جب انگریزوں نے نواب فیض طلب خاں کی ریاست میں شامل کر دیا تو انھیں ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملنے لگا۔ اس میں مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں نے بھی حصہ پایا۔ سرکار انگریز سے بھی غلام نبی خاں کو پینشن جاری ہوئی، جو اُن کی وفات کے بعد مومن کو ملنے لگی۔ غلام نبی خاں کو شاہ عبدالعزیز سے بڑی عقیدت تھی۔ مومن کی پیدائش پر کان میں اذان دی اور مومن نام رکھا۔ گھر والے حبیب اللہ نام رکھنا چاہتے تھے۔ شاہ عبدالقادر کے مدرسے میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ مومن کا حافظہ بہت تیز تھا۔ وہ سبق زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ مومن کی فارسی استعداد بھی غیر معمولی تھی۔ مومن نے طب کی تعلیم اپنے والد غلام نبی خاں سے حاصل کی۔ وہ اپنے چچا غلام حسین خاں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے تھے۔ اپنے اس فن کے بارے میں نواب ٹونک کے قصیدے میں لکھتے ہیں۔

میرے سینے کے صفحے میں ہے رقم علم دانا دلانِ یونانی
مجھ تلک پہنچے ہیں اب و جد سے ورثہ نکتہ ہائے لقمانی

مومن کو فن نجوم میں بھی کمال حاصل تھا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے، پھر دس دن تک ستاروں کے مقام اور ان کے حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا تو نہ زائچہ کھینچتے نہ

تقویم دیکھتے"۔

کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے کہا تھا کہ پانچ دن، پانچ ماہ یا پانچ برس میں مر جائیں گے۔ چنانچہ پانچ ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

نجوم کے ساتھ ساتھ انھوں نے رمل، جفر اور عملیات میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ علم ریاضی اور شطرنج سے بھی شناسائی تھی۔ موسیقی اور نغمے کے بھی شوقین تھے۔ ان کے اس فن کا اعتراف لوگوں نے کیا۔ بین بہت اچھی بجاتے تھے۔ ان کے خسر خواجہ محمد نصیر کے یہاں ماہ میں دو بار محفل سماع منعقد ہوتی تھی۔ مومن مشاعروں میں غزل ترنم سے پڑھتے تھے۔

مومن فکر معاش سے آزاد تھے۔ خوبصورت آدمی تھے۔ ان کی مثنویوں میں ان کے معاشقوں کا اظہار ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے پانچ معاشقے بیان کیے ہیں۔ ان کی پہلی شادی 23 سال کی عمر میں ایک زمیندار کی بیٹی سے ہوئی لیکن شادی آزاد مزاجی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ دوسری شادی خواجہ میر درد کی پوتی سے ہوئی۔

ان کی پہلی کاوش 16 سال کی عمر میں منظر عام پر آئی۔ ابتدائی زمانے میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ صفیر بلگرامی غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کے طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی۔ غرض ہم دونوں نے دہلی کی طرز بیان چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی اور کوئی ناسخ سے نہ ملی"۔ (جلوہ خضر 237)

خودداری بے حد تھی۔ کسی کے آستانے پر سر نہیں جھکایا۔ نوکری نہیں کی۔ دہلی کالج کی ملازمت بھی اختیار نہیں کی، کپورتھلا جانا پسند نہ کیا، ہجو اور مدح نہیں کی۔ دو قصیدے ایک نواب ٹونک اور دوسرا مہاراجہ پٹیالہ اجیت سنگھ کے علاوہ کوئی اور قصیدہ نہ لکھا۔ طبیعت میں نازک خیالی و نازک مزاجی تھی۔ ان کی طبیعت بہت حساس تھی۔ زمانے کی ناقدری کا ذکر ان کے یہاں اکثر ملتا

ہے۔ مومن کی شخصیت کا سب سے اہم جز تضاد ہے۔ ایک طرف وہ شاہ عبدالعزیز کے حلقے کے سرگرم رکن ہیں، تو دوسری طرف کافراداؤں کی زلف گرہ گیر کے اسیر۔ عشق کی راہ میں اپنے آپ کو فنافی المحبوب کیے ہوئے تھے۔ دوسری طرف مجاہدہ بھی تھا۔ محبوب کے یہاں سر کے بل جانے کا عزم بھی ہے، تو دوسری طرف ترک تعلق کی دھمکی بھی۔ شب بتکدے میں تو دن خانقاہ میں گزارتے۔ مومن کی شخصیت کا تضاد ہی ان کی انفرادیت ہے ؎

مومن چلا گیا تو چلا جائے اے بتو آخر قدیم خادم بیت الصنم نہ تھا
چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن چھوڑ اس بت کے آستانے کو

ان کے کلام میں سادگی بھی ہے اور معاملہ بندی بھی ہے۔ تشبیہات واستعارات، تلمیح، صنائع وبدائع کا استعمال بھی حسب موقع اور ضرورت کے مطابق کیا ہے۔ معاملہ بندی کے سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی مومن کا داغ اور جرأت سے تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری رائے میں جرأت کی شاعری ''چوما چاٹی'' کی شاعری ہے۔ اور داغ کی رندانہ بانکپن کی۔ ان کے برخلاف مومن کے یہاں فکر اور جذبہ کا لطیف امتزاج ہیں۔ (مومن شخصیت اور فن ص ۱۸۵)۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

دیدۂ حیران تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

معاملہ بندی کے تعلق سے اور بہت سے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چند غزلوں کی تشریح:

زہر ٹپکے ہے نگاہِ یار سے
موت سوجھی نرگس بیمار سے

محبوب کی آنکھوں سے زہر ٹپک رہا ہے۔ اس سے بیمار عاشق مرگ کے قریب ہے۔ رعایت لفظی کا فائدہ مومن نے خوب اٹھایا ہے۔ زہر سے موت نگاہ کی رعایت سے نرگس کا استعمال ہوا ہے۔

قتل ہوکر ہم بچے آزار سے
عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

قتل ہونے کی وجہ سے ہم مصیبت سے بچ گئے۔ ورنہ ہمیں صعوبتیں برداشت کرنی پڑتیں۔ ہماری زندگی تلوار چلاتے گزر گئی یا ہماری زندگی کو تلوار نے کاٹ کر ختم کردیا۔ دن کٹنا دن گزرنے، بیتنے، پورا ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تلوار کا کام کاٹنے کا ہے۔ تلوار سے عمر کے دن بیت گئے۔

جابجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک
پونچھے ہوں گے دامن کہسار سے

جگہ جگہ جو نہریں جاری ہیں، یہ فرہاد کے پہاڑ کاٹنے کی وجہ سے ہے۔ پہاڑ کھودنے میں فرہاد کو جو پریشانی ہوئی، ان پریشانیوں کی وجہ سے اس نے جو آنسو بہائے، اس سے نہریں جاری ہوگئیں۔ نہریں سرسبز و شادابی کا استعارہ ہیں۔ سخت محنت سے ہی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اس کا پھل ملتا ہے۔

گر نہ کھیلیں جان پر جی ہار دیں
عشق بازی سیکھیے اغیار سے

غیروں سے عشق بازی سیکھیے جو جوکھم نہیں اٹھاتے، لیکن دل دے بیٹھتے ہیں ہم ہیں۔ کہ عشق میں جان پر کھیل جاتے ہیں۔

لاغری سے زندگی مشکل ہوئی
ہے گراں تر جان جسم زار

کمزوری اتنی بڑھ گئی ہے کہ جینا مشکل ہورہا ہے۔ جسم اتنا بدحال وخستہ ہوگیا ہے کہ جان بھی اس پر بوجھل ہورہی ہے۔

کرعلاج جوشِ وحشت چارہ گر
لادے اک جنگل مجھے بازار سے

اے چارہ گر میری وحشت کی شدت کا علاج کر۔ اس کا علاج جبھی ممکن ہے جب تو بازار سے میرے لیے جنگل لا کردے گا۔ ظاہر ہے جنگل بازار سے خریدا نہیں جاسکتا۔ جس طرح سے یہ ناممکن ہے، اسی طرح میرا علاج بھی ناممکن ہے۔

ذکر اشک غیر میں رنگینیاں
بوئے خوں آئی تری گفتار سے

غیر کے آنسوؤں میں رنگینی کے بیان سے اور تیری گفتار سے خون کی مہک ظاہر ہوئی کہ ظلم سے اس نے خون کے آنسو روئے۔ تیری باتوں سے پتہ چلا کہ تو نے ہی ظلم کیا۔

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی
جرم ثابت ہوگیا انکار سے

نصیحت کرنے والا بھی عشق کا دعویدار ہے۔ وہ تو دوسروں کو منع کرتا ہے۔ روکتا ہے۔ وہ اسے تسلیم نہیں کرسکتا ہے۔ وہ اس سے انکار کرتا ہے۔

چھڑ کے ہے کان ملاحت نون کیا
خود لپٹ جا سینۂ افگار سے

معشوق نے حسن کا نمک چھڑک رکھا ہے۔ عاشق اسے زخمی سینے سے لپٹ جانے کی بات کر رہا ہے۔ زخم پر نمک چھڑکنے کا محاورہ یہاں لطف دے رہا ہے۔

گردعا کرتا ہوں مومن وصل کی
ہاتھ باندھے ہے وہ بُت زنار سے

مومن کہہ رہے ہیں کہ میں تو معشوق سے ملنے کی دعا کرتا ہوں کہ وہ ملے، لیکن اس نے تو جنیو سے ہاتھ باندھ رکھا ہے۔

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندھ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروّت کس سے دیکھا جائے ہے

معشوق عاشق کو پریشان کرتا اور چھیڑتا ہے۔ دشمن پر مہربان ہے۔ یہ تو عاشق پر ستم ہے کہ اس کے سامنے رقیب کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور اس پر ظلم کیا جائے یہ عاشق کے لیے نا قابل برداشت ہے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

معشوق جب سامنے سے اچانک نمودار ہو جاتا ہے تو اس کے حسن و جمال سے مجھ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا بیان مشکل ہے۔ دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ اسے قابو کرنے کے لیے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں، لیکن دل ہاتھوں میں کب آتا ہے۔

حال دل کیوں کر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھا بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

بدحال عاشق کہتا ہے کہ میں اپنے دل کی حالت بیان نہیں کر سکتا۔ قوت گویائی ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ تکیے سے سر اٹھانے سے کچھ حاصل نہیں، دل ہی بیٹھ گیا ہے۔

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم قسم کھا جائے ہے

معشوق رقیب سے ملا تھا، سچ ہے۔ اس کی یاد دلا کر مجھے پریشان نہ کرو۔ میں جب معشوق سے شکایت کرتا ہوں تو وہ قسم کھالیتا ہے کہ میں دشمن سے نہیں ملا، میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کی قسم کا اعتبار نہیں ہے، لیکن کرنا پڑتا ہے۔

رشک دشمن نے بنا دی جان پر اے بیوفا
کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

اے معشوق تو مجھ سے بے وفائی کر کے دشمن سے التفات کرتا ہے۔ اس لیے میں دشمن پر رشک کرتا ہوں جس سے میرے جان پہ بن آئی ہے۔ ہم بگڑیں نہ بگڑیں، کب تک برداشت کریں گے۔ حال بگڑ گیا ہے۔

تلخ کام عشق شیریں لب جیسے تر کیا ہوا
شور بختی سے مزا ہی زندگی کا جائے ہے

عشق کے سخت کام سے اگر ہونٹوں کو شیرینی کی مٹھاس مل گئی تو کیا ہوا۔ خرابی قسمت سے زندگی کا لطف چلا گیا ہے۔

حسن روز افزوں پہ غرّا کس لیے اے ماہرو
یوں ہی گھٹتا جائے ہے جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

ہر کمال را زوال۔ جسے عروج حاصل ہوگا اسی کا زوال بھی ہوگا۔ جوانی میں حسن روز بڑھتا

ہے۔لیکن عمر کے ساتھ وہ گھٹنے لگتا ہے۔کس لیے اپنے حسن پر غرور کر رہے ہو۔

پونچھے آنسو وارثوں کے کیا کروں اب ہائے ہائے
داغ میرے خون کا دامن سے چھوٹا جائے ہے

اس کے خاتمے پر افسوس ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ہائے ہائے کرنے سے کیا حاصل۔یہ تو وارثوں کے تسلی دینے کا وقت ہے۔ان کے آنسو پونچھنے کا ہے۔آنسوؤں سے خون کے دھبے چھڑانے کی مناسبت اچھی ہے۔

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

معشوق غیر کے ساتھ آتا ہے، میں حیران ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔اس کے باوجود دل اس کے استقبال کو بے قابو ہو رہا ہے۔

تاب وطاقت صبر وراحت جان وایماں عقل وہوش
ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

عشق میں سب سے پہلے راحت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔راحت کے ساتھ دھیرے دھیرے توانائی وطاقت بھی ختم ہو جاتی ہے۔پھر صبر بھی چلا جاتا ہے اور آخر میں جان، ایمان، عقل وہوش سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔دل دینے کے ساتھ ساتھ ان ساری چیزوں سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

رو رہا ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں
آب گوہر کے لیے آنکھوں سے دریا جائے ہے

میرا معشوق جب ہنستا ہے تو اس کے دانت گوہر کی طرح دکھائی دیتے تھے۔انھیں آب گوہر کے لیے میں رو رہا ہوں۔رونے سے آنسو بہتے ہیں، جس سے دریا جاری ہوتا ہے اور دریا میں موتی گوہر ملتے ہیں۔

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

یہ کیسی بیکسی ہے کہ میری مجبوری پر غیر رو رہا ہے، میرے جنازے کے ساتھ اپنے رونے

والے بھی نہیں ہیں۔ یا خدا ایسی بیکسی کا خاتمہ کر دے۔

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا میں اٹھایا جائے ہے

اے معشوق ترے عاشق کا مرنا بھی مشکل ہے۔ کمزوری کی وجہ سے دنیا سے بھی نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔

پندگو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون
اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

اے نصیحت کرنے والے تو ہی بتا کہ سودا کس کو ہے، کون جنوں میں بک رہا ہے، کسی اور کی نہیں سنتا۔

دیکھیے انجام کیا ہو مومن صورت پرست
شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

مومن کہہ رہے ہیں میں تو صورت پرست ہوں، عاشق ہوں۔ کلیسا کی طرف جا رہا ہوں جہاں صورت ہی صورت ہے وہاں پردہ نہیں ہے۔

ہوئی تاثیر آہ وزاری کی
رہ گئی بات بے قراری کی

عشق کے میدان میں آہ وزاری کا اثر ہوا کیوں کہ آہ وزاری میں آواز آتی ہے، سنائی دیتی ہے، اس لیے اس کا اثر ہوا، لیکن بے قراری بے چینی اور بے اطمینانی محسوس کی جاتی ہے اس لیے جس پہ گزرتی ہے وہی جانتا ہے، اس کا اثر دوسروں پر نہیں پڑتا اس لیے عاشق کی بے قراری کی بات ہی نہیں ہوئی۔

شکوۂ دشمنی کریں کس سے
واں شکایت ہے دوستداری کی

دشمنی کی شکایت کس سے کی جائے، کہاں کی جائے جہاں دوستداری کی شکایت کی جا رہی ہے۔

مبتلائے شب فراق ہوئے
ضد سے ہم تیرہ روز گاری کی

زمانے کے کاروبار کی وجہ سے ہم معشوق سے جدا ہوئے۔ رات میں کبھی اجالا ہوتا ہے کبھی اندھیرا۔ یہ چاند کی رفتار پر منحصر ہے۔ کبھی روشنی کا پکھواڑا تو کبھی تاریکی کا۔ اسی زمانے کے کاروبار کے سبب رات کے اندھیرے کی وجہ سے ہمیں محبوب سے الگ رہنا پڑا۔

یاد آئی جو گرمِ جوشیِ یار
دیدۂ تر نے شعلہ باری کی

محبوب کی گرم جوشی جب یاد آئی۔ یعنی جب ملتا تھا تو بہت تپاک سے ملتا تھا۔ لیکن اس کی جدائی میں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں روتے روتے آنکھیں لال ہوگئی ہیں۔ آنکھوں کے لال ہونے کو شاعر نے شعلہ باری کہا ہے۔

کیوں نہ ڈرجاؤں دیکھ کر وہ زلف
ہے شبِ ہجر کی سی تاریکی کی

جدائی کی رات سیاہ بھی ہوتی ہے اور طویل بھی۔ زلف کا حسن بھی طوالت اور تاریکی ہے اسی لیے مومن کہہ رہے ہیں کہ زلف کو دیکھ کر ہجر کی رات کی یاد آجانے کے سبب ڈر لگتا ہے۔

پاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی
بات اپنی امیدواری کی

عاشق کہہ رہا ہے کہ مجھے پوری امید تھی اس لیے میں اپنی دعویداری کی بات رقیب سے کہہ دی کہ معشوق مجھے زیادہ چاہتا ہے۔

بسکہ ہے یار کی کمر کا خیال
شعر کی سوجھتی ہے باریکی کی

دو چیزوں میں ہی باریکی نظر آتی ہے۔ ایک محبوب کی کمر میں دوسرے شعر میں۔ محبوب کی کمر کا حسن اس کا پتلا ہونا ہے۔ اسی طرح شعر میں اگر باریکی نہ ہو تو اس میں کوئی لطف نہ ہوگا۔

کردے روزِ جزا شبِ دیجور
ظلمت اپنی سیاہ کاری کی

اے حساب کرنے والے جس دن میرا حساب ہو تو اماوس کی رات ہو۔ کیوں کہ میرے اعمال بہت بُرے ہیں۔ میری سیاہ کاری کی تاریکی کا پتہ نہ چل سکے۔

تیرے ابرو کی یاد میں ہم نے
ناخن غم سے دل کی فگاری کی

مومن کہہ رہے ہیں کہ معشوق کے ابرو کی یاد میں ہمارا دل غموں کی وجہ سے زخمی ہے۔ ابرو کو تلوار سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اس کا کام بھی زخم دینا ہے۔ جب اس کی یاد آئی تو ہمیں اتنا غم ہوا کہ دل زخمی ہو گیا۔

قتل دشمن کا ارادہ ہے اسے
یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

معشوق رقیب کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ جب کی میں نے ہر طرح فرماں برداری کی، جاں نثاری کی، ہماری جاں نثاری کی وہ ہمیں یہ سزا دے رہا ہے۔

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن
حاصل اس بت سے شرمساری کی

مومن مسلمان ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معشوق سے شرمندگی اٹھانی پڑی، مومن مسلمان اور بت کا بہترین امتزاج پیدا کیا ہے۔

مومن کا دور غالب، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا دور ہے۔ مومن غالب سے چھوٹے تھے، لیکن ۱۸۵۷ سے پہلے چلے گئے۔ ذوق ۱۸۵۷ میں گئے، لیکن محمد حسین آزاد نے ذوق کے مطالعے کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ بہادر شاہ ظفر قید فرہنگ میں رنگون چلے گئے۔ ان سے وابستہ ہونا اور ان کو وابستہ کرنا جرم عظیم تھا۔ غالب ۱۸۵۴ کے بہت بعد تک حیات رہے اور حالی نے یادگار غالب لکھ کر مطالعات غالب کو بلندیوں تک پہنچایا اور مومن اور کلام مومن پر ابھی کام کی ضرورت ہے۔ یہ صفحات کلام مومن کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرنے کی ایک ادنی سی کوشش ہے۔ اس کام کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بے حد شکریہ، جس کے تعاون سے اس کام کا آغاز ہوا اور ۲۴ مارچ 2015 کو ایک سیمینار کا انعقاد ممکن ہو سکا۔ سیمینار میں پڑھے گئے پرچے شامل اشاعت ہیں۔ امید ہے کہ اس سے کلام مومن کے مطالعہ کا رجحان بڑھے گا۔

ڈاکٹر عقیل احمد

پروفیسر نصیر احمد خاں

اردو شاعری کے اسالیب میں مومن کی قدر

حکیم مومن خاں مومنؔ نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ اور رباعی میں شاعری کی ہے۔ لیکن ان کا میدان غزل ہے۔ غزل کی پوری روایت ان کے کلام میں موجود ہے۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی لیکن بعد میں اپنی راہ خود بنائی۔ وہ جمال پرست تھے۔ پیکر تراشی کے دلنواز نمونے ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ادابندی اور محاورہ بندی زیادہ ہے۔

مومن زندہ دل، خوش طبع اور عاشق مزاج انسان تھے۔ ان کے یہاں فحاشی اور عریانی کی جگہ شائستگی ہے جس کی وجہ معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ وہ اپنے وقت کے مشہور صوفی شاہ عبدالعزیز کے درس میں شریک رہے ہیں، جنھوں نے پیدائش کے وقت کان میں نہ صرف اذان دی تھی بلکہ مومن نام بھی تجویز کیا تھا۔ مومن خوددار، انانیت پسند اور سلیم النفس انسان تھے۔ انھیں نازک خیال، مضمون آفریں اور دقت پسند شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ تغزل، مکرِ شاعرانہ، داخلیت، ندرت اسلوب اور پیچیدہ بیان کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں مختلف علوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور مروجہ الفاظ کو نئے پیمانوں میں ڈھال کرنت نئے معنی مراد لیے ہیں۔ مومن نے اپنی فکر کا دائرہ عشق و محبت اور معاملات عشق تک محدود رکھا ہے۔ وہ رعایت لفظی کو قادرالکلامی کی پہچان سمجھتے ہیں۔

مومن کے کلام میں معنی کی اتنی پرتیں اور بھول بھلیاں ہیں کہ ان تک پہنچنے کے لیے تشریح وتفہیم میں کئی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ عہد مومن کے لسانی مزاج پر عبور

۲۔ فن موسیقی، علم نجوم، علم طب اور علم حساب وغیرہ کی اصطلاحوں سے واقفیت

۳۔ فارسی زبان پر دسترس

۴۔ الفاظ کے نئے معنوں کے لیے نئے سیاقوں کی پہچان

۵۔ اختراع شدہ نئی تراکیب و مرکبات کے مفہوم و معنی کی شناخت

۶۔ مومن کے مکرِ شاعرانہ کی سمجھ

۷۔ تخلص کے نت نئے استعمال کی جانکاری

۸۔ فارسی کی شعری روایت سے واقفیت

۹۔ اشعار کی صحیح قرأت

۱۰۔ مومن کی ہم عصر شاعری کے عناصر سے واقفیت

امیر خسرو سے لے کر موجودہ دور کی اردو شاعری کے اسالیب بیان کو ہم بارہ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو اس طرح ہیں: ریختہ گوئی (نمائندہ شاعر امیر خسرو)، دکنی گوئی (نمائندہ شاعر قلی قطب شاہ)، ایہام گوئی (نمائندہ شاعر قایم و آبرو)، عوام پسند گوئی (نمائندہ شاعر نظیر اکبرآبادی)، سہل پسند گوئی (نمائندہ شاعر میر تقی میر)، پر تکلف گوئی (نمائندہ شاعر شیخ ناسخ)، ریختی گوئی (نمائندہ شاعر رنگین)، دقت پسند گوئی (نمائندہ شاعر غالب)، طنز و مزاح گوئی (نمائندہ شاعر اکبرالہ آبادی)، محاورہ گوئی (نمائندہ شاعر داغ دہلوی)، علامت گوئی (نمائندہ شاعر میرا جی) اور جدید معیار گوئی (نمائندہ شاعر فیض احمد فیض)۔ ان اسالیب میں دقت پسند گوئی میں ہم غالب کے علاوہ مومن اور اقبال کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن کے یہاں دقت پسند عناصر کی وجہ ان کی خواص پسند شاعری ہے۔ مزید برآں عربی و فارسی زبانوں سے اردو میں غیر مروجہ الفاظ مستعار لینے کے عمل میں ایک وجہ ہے جو ان کے کلام کو دقت پسند بناتا ہے۔ ان شعرا نے اپنے کو بیان کرنے کے لیے نئے مرکبات و اصطلاحات بھی وضع کی ہیں، کیونکہ اردو زبان ان کے اشعار وارضیات کو پیش کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ ان حضرات نے اپنی حسیتوں کو بیان کرنے کے لیے مروجہ الفاظ کو نئے سیاقوں میں بھی ڈھالا ہے۔ جہاں تک مومن کے اسلوب کا تعلق ہے، اس کی ساری بنیادی خصوصیات ہیں۔

۱۔ عربی و فارسی الفاظ کو بے دریغ استعمال کرنا

۲۔ فن موسیقی، علم طب، علم نجوم اور علم حساب کی اصطلاحوں کو استعمال کرنا
۳۔ نئی تراکیب و مرکبات وضع کرنا
۴۔ ہم صوت الفاظ کو نئے سیاقوں میں لا کر انھیں نت نئے معنی دینا
۵۔ معاملاتِ عشق میں بہانے تلاش کر کے اپنا مطلب نکالنے کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا جن کے بظاہر معنی کچھ ہوں اور مراد کچھ اور ییے جائیں، جسے ضیا بدایونی نے اپنی کتاب میں 'فکر شاعرانہ' کہا ہے۔
۶۔ کلیدی الفاظ میں مومن عشق، محبت، آئینہ، آتش، پردہ، صحرا، شب، اور سراپے میں بالخصوص آنکھ، ہونٹ اور زلف بنیادی ہیں، جن کے Collocates سے مومن کا کلام بھرا پڑا ہے۔
۷۔ تخلص مومن کا برجستہ استعمال۔

مومن کے اسلوب میں دقت پسندی کے علاوہ سہل پسندی بھی ہے۔ یہ دونوں Currents مومن کے کلام میں آگے پیچھے چلتے ہیں لیکن اول الذکر غالب ہے۔ غالب اور اقبال کے یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ مومن کے کلام سے چند مثالیں دیکھیے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا
یا میرے اضطراب نے مارا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

کیا کروں اللہ سب ہے بے اثر
ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کے اسلوب کی اس خصوصیت کے ساتھ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جو ان کے ہی لفظ کو الگ الگ سیاقوں میں لا کر ان سے مختلف معنی مراد لیے گئے ہیں۔ جیسے:

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو
بندے کو بھی سلام ہے ایسے سلام کو

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب

مومن کو اردو کی عشقیہ شاعری کا امام کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں معاملاتِ عشق اور روداِدِ عشق کا بیان ہے جسے انھوں نے اپنی بھرپور فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ نبھایا ہے۔ ان کا عشق مزاجی ہے، جس کے تین محور ہیں: معشوق، عاشق، رقیب اور بس۔ ان کی طبیعت بھی عاشقانہ تھی اس لیے انھوں نے اس میدان میں خوب گل کھلائے ہیں۔ مومن کے عشق میں عریانی کے بجائے شائستگی ہے، جس کی وجہ خاندان کی مذہبی روایت ہے۔ وہ خود بھی تقویٰ کے قائل تھے۔ ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا۔

تاسحر شام عبادت تری شب بیداری
شارح ''آیت الکرسی'' بس حی القیوم

مومن کا محبوب صنف نازک ہے، جس میں اردو غزل کے محبوب کی تمام صفات موجود ہیں، یعنی خود بین وخود آرائی، ظلم وستم ڈھانا، بے وفائی اور وعدہ شکنی وغیرہ لیکن مومن ہمیشہ سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ ان کی انانیت بھی کبھی کبھی آڑے آجاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یاں پیار کم ہوا

مومن اپنے محبوب کے سراپے کی تعریف میں چہرے سے نیچے نہیں اترتے، البتہ کبھی کبھی

خرام کی تعریف کر لیتے ہیں۔ آنکھوں، ابروؤں، زلفوں اور ہونٹوں کی تعریف میں انھوں نے بے شمار شعر کہے ہیں۔ وہ محبوب سے وصل کی بڑی خواہش رکھتے ہیں جو کبھی نصیب بھی ہو جاتا ہے۔ محبوب کی آنکھ کے بوسے کے وقت پاکیزگیٔ اظہار دیکھیے:

بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی
مومن کو یاد کیا حجر اسود آگیا

لیکن کچھ اس طرح کے شوخی بھرے شعر بھی کہہ جاتے ہیں:

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
الجھا ہے اس شوخ کے بند قبا کے ساتھ

مومن دوسرے شاعروں کی طرح اپنے معاملات میں عموماً شیخ، ناصح اور واعظ کو بیچ میں نہیں لاتے اور نہ ہی شراب و میخانہ کا زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ گل و بلبل و چمن جیسی علامتوں سے بھی ان کے یہاں گریز ملتا ہے۔ جو اردو شاعری میں عام ہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مومن نے غزلوں کے مقطعوں میں اپنے تخلص کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور معنی و مطالب میں زبردست تنوع پیدا کیا ہے، اس سلسلہ میں ذیل میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

دشمن مومن سے رہے بت سدا
مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام، آگ کا عذاب ہمیں

اس نام کے صدقے جس کی بدولت
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مومن کو اپنی عالمانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ مختلف علوم، بالخصوص فن موسیقی، علم نجوم، علم طب، علم حساب اور وقت شناسی پر دسترس رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر بھی عبور تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی انھوں نے اپنا دیوان چھوڑا ہے۔ انھوں نے شاعری میں جو راہ نکالی وہ ذوق، غالب اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ جیسے ہم عصروں سے مختلف تھی۔ عشقیہ شاعری میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ غالب جیسا بڑا شاعر بھی اس میدان میں کچھ بڑا نہ کہہ سکا۔ بقول محمد حسین آزاد غالب تو مومن کے اس شعر پر اپنا پورا دیوان تک قربان کرنے کو تیار تھے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے بے پناہ صلاحیتوں نے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح انھیں بھی خود تعلّی کے شعر کہنے پر مجبور کیا۔ ذیل میں چند مثالیں دیکھیے:

گو ہم صفحہ ہستی پہ تھے ایک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقشِ بٹھا کے اُٹھے
میرے سینے کے صفحہ میں ہے رقم
علمِ دانا دالانِ یونانی
ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنادیا

مومن نے میر، ذوق اور غالب وغیرہ دہلی کے دوسرے شاعروں کی طرح اپنے وطن عزیز دہلی کے تعریف میں بھی شعر کہے ہیں۔ دہلی کو جنت پر ترجیح دیتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہو صورت خاک، دل لگنے کی جنت میں بھلا مومن
میری نظروں میں شاہجہان آباد کا نقشہ

مومن کی شاعری کا ایک بنیادی وصف مکرِ شاعرانہ ہے۔ یہ اصطلاح ضیا بدایونی نے مومن کے ایسے اشعار کے لیے وضع کی ہے جن میں وہ مختلف بہانوں سے اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں،

یعنی بظاہر کہتے کچھ ہیں اور مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

سرگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو
منظور ہوتو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں
یہ جامہ پارہ پارہ تڑپنے سے ہوگیا
صبح شب فراق ہے تو بدگماں نہ ہو

مومن نے اپنے کلام میں عربی و فارسی الفاظ، مرکبات اور تراکیب کا بے دریغ استعمال کیا ہے، جو ان کے اسلوب کو دقت پسند بناتی ہیں۔ سبک رفتن، سخت کوش، سخن گستر، شوق شکوہ اثر، تشنہ کامی، نظر بند وغیرہ جیسی ترکیبیں ہیں، جو ان کے اشعار میں بھری پڑی ہیں۔ اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے غیر مروجہ استعمال کی چند مثالیں دیکھیے:

ہر حرکت محرکِ شوق و مہیج ہوس
قل قل شیشہ، قاہ قاہ مطرب طرفہ زیوری
نہ پوچھ گرمیٔ شوقِ ثنا کی آتش افروزی
بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمع فکرت کا
رقص و سرور سے تری انجمن نشاطِ گرم
شعلہ دود و عارض روشن، زلف عنبری
وہاں کی لاکھوں خلش واں کی ہزاروں فکریں
اک جہاں اس پہ یہ ہنگامۂ آلام و غموم

مومن کونئی تراکیب وضع کرنے کا بھی شوق تھا جو شاید عرفی اور بیدل کا اثر ہے۔ چند مثالیں دیکھیے: آہوئے نیم خواب، بے پردہ خرامی، آشوب گاہ، شوقِ شکوہ اثر (یعنی وہ شوق جس کا اثر شکوہ جیسا ہے)، کافر استخواں پرست (یعنی وہ حاسد جو کلام کی بلاغت سے بے بہرہ ہے) وغیرہ۔

مومن کی شاعری کے کلیدی الفاظ میں سب سے اہم آنکھ ہے، جس کی رعایت سے تشکیل پانے والے الفاظ ان کے اشعار میں بے شمار ہیں۔ چیزوں کو دیکھ کر انھیں محسوس کرنے کے عمل کا اظہار مومن کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مومن کی غزلوں میں کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس کے دو ایک شعروں میں آنکھ کی رعایت سے مضمون نہ باندھا گیا ہو۔ کہیں کہیں ایسے الفاظ کو ردیف اور قافیوں میں لاکر نت نئے معنوں میں بھی ڈھال دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے :

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مجھ کو کیا کام کہ آئینہ کی حیرت دیکھوں
دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

جادو کو کیا نرگس جادو نے نظر بند
یہ تشنہ کامیِ نگہ گرم دیکھنا

شکوہ کیا بیدادگری کا کیجیے اس سے، دیکھو تو
دیکھے ہے ظالم خنجر، جب ہم زخم جگر دکھلاتے ہیں

دیکھ گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے
اشک غماز میں کیا، آنکھوں میں گھر کرتا ہے

آئے غزالی چشم سدا میرے دام میں
صیاد ہی رہا، میں گرفتار کم ہوا

جو نقاب الٹی، میری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا

کچھ نہ سوجھا، عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر
دشمن جاں عاشقاں دیدار
گر نگاہ تیغ ہے مژۂ خنجر
پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں
مجلس میں نامہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے تجھ کو دیکھ کر اغیار کی طرف

مومن کے کلام کے دوسرے کلیدی الفاظ میں زلف، مومن، آئینہ، آتش، پردہ، شب، صحرا، عشق ومحبت اور لب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

مومن کا اسلوب دقت پسند ضرور ہے لیکن اس طرح انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں ایسے فصیح اشعار بھی مل جاتے ہیں جو عام قاری کے لیے صحرا میں نخلستانوں کا کام کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی، معاملہ بندی، نازک خیالی، اور فکر انگیزی کے علاوہ روانی، سادگی اور شوخی بھی ہے۔ انھوں نے تصورات کو تحریروں میں ڈھالا ہے۔ وہ بلیغ اشاروں سے شاعری کو معتبر بنانے کا فن جانتے ہیں۔ وہ عشقیہ شاعری کے اسلوب کے مزاج شناس ہیں اور اس تعلق سے اپنے ہم عصروں میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ مومن سے زندگی نے بے وفائی کی اور کم عمری میں ان کا انتقال ہوگیا، ورنہ عالمی شاعری کے افق پر انگریزی کے رومانی شاعر شیلی (ان کا انتقال بھی کم عمری میں ہو گیا تھا) کے بغل میں ایک زیادہ روشن، درخشاں، ستارہ چمک رہا ہوتا۔ مومن کے چند زبان زد اشعار ملاحظہ فرمایئے جو ان کی شاعری کی ایک حد تک نمائندگی بھی کرتے ہیں:

یہ عذر امتحانِ جذبۂ دل کیا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک ہم ہی کیا، سبھی چاک گریباں ہوں گے

اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے
کیا قیامت ہے دل کا آجانا

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ لگ جائے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
ان کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

☆☆☆

نسیم عباسی

مومن کی چند غزلوں کی شرح

محشر میں پاس کیوں دمِ فریاد آگیا
رحم اُس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آگیا

روز قیامت ہر ایک مظلوم کی فریاد سنی جائے گی۔ اور داور حشر سب کی داد کو پہنچے گا۔ کہتے ہیں کہ مجھے فریاد کے وقت محبوب کے پاس آجانے سے تعجب ہوا، کیونکہ اس سے پہلے تو میری فریاد پر اس نے کبھی ترس نہیں کھایا۔ بلکہ سنی ہی نہیں۔ داور حشر کے سامنے یہ تلافی مافات کا ڈھونگ مصلحتاً ہے تاکہ اللہ کے سامنے خود کو اچھا بنا کر پیش کر سکے۔

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

شعرا نے زلف کو زنجیر اور جال وغیرہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ محبوب کی لمبی زلفیں اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ عاشق اس کی زلفوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یک طرفہ صورت حال ہے کہ محبوب کی وہی زلف دراز جو عاشق کو پھنسانے کے لیے تھی، اسی کے لیے مصیبت کا سبب بن گئی۔ خود کے پاؤں اس کی زلف میں پھنس گئے۔ شکاری کے اپنے ہی دام میں پھنس جانے سے جو مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی ہے، وہ عبرت کا مقام بھی ہے۔ دوسرا مصرع ان دونوں کیفیتوں کی بھر پور عکاسی کر رہا ہے۔ مومن کا یہ مصرع اتنا برجستہ اور مکمل ہے کہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

ناکامیوں میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
شیریں کو درد تلخی فرہاد آگیا

عام طور پر ہوتا تو یہ ہے کہ عاشقوں کو فرہاد اور مجنوں سے تشبیہ دی جاتی ہے، لیکن یہاں ناکام عاشق سے فرہاد کو تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے محبوب کو سیدھے طور پر شیریں کہنے کا جواز پیدا

ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کو عاشق کی ناکامیوں کے درد کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ گویا شیریں کو فرہاد کی تلخ کامیوں کا درد محسوس ہوا۔ شیریں کو تلخی کا درد صنعت تضاد کی اچھی مثال ہے۔

ہم چارہ گر کو یوں ہی پہنائیں گے بیڑیاں
قابو میں اپنے گر وہ پری زاد آگیا

جس پر دیو و پری، جن و پری کا سایہ پڑ جائے تو وہ دیوانہ ہو جاتا ہے اور جنگل کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔ جب کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا تو اس کو قابو کرنے کے لیے بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ پری یا جن کو قابو کرنے کے لیے اوراد و وظائف کیے جاتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی وہ پڑھت الٹی پڑھنے والے پر پڑ جاتی ہے اور وہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر وہ پری زاد یعنی محبوب ہمارے قابو میں آگیا تو اس معالج کو، جس کی تجویز پر ہمیں بیڑیاں پہنائی گئی ہیں، ہم بھی اسے بیڑیاں پہنائیں گے۔

دل کو قلق ہے ترک محبت کے بعد بھی
اَب آسماں کو شیوۂ بیداد آگیا

آسمان تمام تر مسائل اور مصائب و ظلم و زیادتی کا استعارہ ہے۔ عاشقوں کو خاص طور پر وہ طرح طرح سے ستاتا رہتا ہے۔ اس نے ہمیں یہ سمجھایا کہ ترک محبت کر دیں تاکہ سارے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔ لیکن ترک محبت کے بعد بھی دل کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں۔ آسمان کو نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کر کے بیداد کا سلیقہ آگیا ہے۔

وہ بدگماں ہوا جو کہیں شعر میں مرے
ذکرِ بُتانِ خلّخ و نوشاد آگیا

خلّخ ماوراء النہر میں ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے جو حسن اور زیبائی کے لیے مشہور تھا۔ نوشاد بھی شہر معشوقاں کے طور پر قدیم فارسی شعراء کے یہاں استعمال ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر میں نے اپنے کسی شعر میں خلّخ اور نوشاد کے حسینوں کا ذکر کر دیا تو میرا محبوب غیرت اور رشک سے میری طرف سے بدگماں ہو گیا۔

تھے بیگناہ جرأتِ پابوس تھی ضرور
کیا کرتے وہم خجلت جلّاد آگیا

ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ ایسی صورت میں ہمارا قاتل ہمیں قتل کرتا تو اندیشہ تھا کہ بے گناہ کے قتل سے اس کو شرمندگی ہوتی۔ اس کو اس شرمندگی سے بچانے کے لیے ہم پر لازم ہو گیا تھا کہ پابوسی کی جرأت کریں تاکہ یہ گناہ ہمارے قتل کا جواز بن جائے۔ مومن کی فکر شاعرانہ مشہور ہے۔ یہاں بھی اپنے لیے قدم بوسی کا جواز خوب نکالا ہے۔

محبوب کو شرمندگی سے بچانے کے لیے شعرا نے طرح طرح کے مضمون باندھے ہیں لیکن خسرو نے بڑی لاجواب بات کہی ہے۔ کہتے ہیں:

روز محشر اگر پُرسند خسرو چرا کشتی
چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم

اگر روز حساب تجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تو نے خسرو کا قتل کیوں کیا، تو میں تیرے قربان اگر مجھے یہ پہلے ہی بتا دے کہ تو کیا کہے گا تاکہ میں بھی وہی بات کہوں اور کوئی تضاد پیدا نہ ہو۔ میرا بیان مختلف نہ ہو۔

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقت وصال
دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

کہتے ہیں کہ محبوب ہم سے گریزاں ہی رہتا تھا۔ ہم نے ایسا مکر کیا کہ اسے یقین آ گیا کہ ہمارے اندر اب وصال کی طاقت ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ دھوکے سے ہمارے قریب آ گیا اور اس کے بعد مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بقول دیا شنکر نسیم ؎

ہوتا ہے دوات میں قلم بس

☆

ذکرِ شراب وحور کلامِ خدا میں دیکھ
مومن مَیں کیا کہوں مجھے کیا یاد آ گیا

یہ عام بات ہے کہ کچھ ناموں، کچھ چیزوں کے ساتھ آدمی کی زندگی میں گزرے ہوئے اچھے بُرے واقعات وابستہ ہوتے ہیں۔ جب وہ چیزیں، وہ نام سامنے آتے ہیں تو ذہن خود بخود ان واقعات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کے تلاوت کلام اللہ کرتے کرتے اس وقت پیش آیا جب حوروں اور شراب کا تذکرہ آیا اور ان کا ذہن غیر ارادی طور پر گزری ہوئی زندگی

میں شراب اور شباب کی محفلوں اور صحبتوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ قرآن جیسی مقدس کتاب پڑھتے پڑھتے فسق و فجور کی باتوں کے ذہن میں آنے کا مومن کو افسوس ہے۔ میں کیا کہوں کا فقرہ اسی بات کی دلیل ہے۔

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

محبوب جھوٹے وعدے کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ عاشق خوش ہو جائے گا۔ مومن کہتے ہیں کہ ہم ایسی باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی دشمن مبارک باد دے۔ دشمن کسی کی خوشی سے خوش ہو، ممکن ہی نہیں۔

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

قفس میں دل لگنے لگا ہے۔ اس سے یہ فال لیتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آشیانہ اُجڑ گیا ہے ورنہ قید میں سے رہا ہو کر گھر جانے کی آرزو ہوتی ہے، گھر کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ قفس میں دل لگنا گھر کی بربادی کا شگون بد ہے۔

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں
حضرتِ ناصح کریں ارشاد کیا

مسلسل آہ و زاری اور نالۂ فریاد جاری ہے۔ حضرت ناصح کو اتنا موقع ہی نہیں کہ ہمیں کچھ سمجھا سکیں۔ اگر نالہ کچھ دیر تک رکتا تو کہنے سننے کی گنجائش ہوتی۔

ہیں اسیر اُس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

ہم نے اپنے محبوب کو اپنا قیدی بنالیا ہے۔ یعنی محبوب ہمارے خیالوں میں اس قدر بسا ہوا ہے کہ کسی لمحے بھی اس کا خیال ہم سے جدا نہیں ہوتا، گویا اس معنی میں وہ ہمارا قیدی ہے اور ہم اس کے قیدی، کہ اس کی محبت کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے، تو ایسی حالت میں شکار اور شکاری کو ایک دوسرے سے مختلف کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔

شوخ بازاری شیریں بھی مگر
ورنہ فرق خسرو و فرہاد کیا

خسرو بھی شیریں کا عاشق تھا اور فرہاد بھی۔ محبت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ شیریں نے فرہاد کو چھوڑ کر خسرو کو ترجیح دی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیریں ایک چالاک بازاری عورت تھی جس نے محبت کو پیسوں میں تولا۔ اور غریب فرہاد کی محبت پر خسرو کی بادشاہی کو پسند کیا۔

نشۂ اُلفت سے بھولے یار کو
سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کو

نشہ کی کیفیت میں کچھ یاد نہیں رہا کرتا۔ یہاں جو نشہ ہے وہ الفت کا ہے اور وہ اس قدر گہرا ہوتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۔

یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے

نشۂ الفت کی سرشاری جب اپنے آپ سے بھی بے خبر کر دے تو ایسی بھی منزل آ جاتی ہے کہ محبوب بھی یاد نہیں رہتا۔ ایک شعر یاد آتا ہے جس میں اسی کیفیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ترے در پہ سجدہ کیا نہیں ہمیں کچھ خیال رہا نہیں
ترے آستاں کے خیال میں ترے آستاں سے گزر گئے

☆

ہمارا نالہ اس قدر شدید اور بے پناہ ہے کہ اس کی گرمی سے آسمان دھواں بن کر اڑ جائے۔ آسمان کا دھواں ہو جانا بڑا دلچسپ ہے۔ دھواں بھی اوپر اٹھتا ہے، اور پھیل کر آسمان جیسا ہی لگتا ہے۔

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بیوفا پھر حاصلِ بیداد کیا

دل آزاری سے محبوب کا مقصد یہ ہے کہ عاشق کو تکلیف پہنچے اور میں آہ وزاری نالہ وفریاد کروں اور وہ اس کا لطف لے۔ لیکن اگر فی الواقع ایسا نہ ہو تو پھر محبوب کے ظلم وستم کا حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یعنی محبوب کا ظلم وستم بے کار گیا کہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اس لیے مومن کا مشورہ یہ

ہے کہ وہ ظلم وستم سے باز رہے۔ مومن تو محبوب کی دل آزاری سے بچنا چاہتے ہیں مگر غالب کو دیکھیے کہ وہ محبوب کی دل آزاری ترک کرنے پر افسوس کرتے ہیں۔

نالہ اِکدم میں اڑا ڈالے دھواں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

☆

پاؤں تک پہ پہنچی وہ زلف خم بخم
سرو کو اب باندھیے آزاد کیا

محبوب کی زلفیں اتنی لمبی ہوگئیں کہ اس کے پیروں تک آگئیں۔ چونکہ ان میں خم بھی پڑ گئے ہیں اس لیے زنجیر کا کام کررہی ہیں۔ زنجیر میں بھی حلقے ہوتے ہیں۔ محبوب کے لمبے قد کو سرو سے تشبیہ دی جاتی ہے اور سرو کو آزاد بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باغ کے سارے درختوں سے الگ اونچا اور ممتاز ہوتا ہے۔ جب محبوب کی زلف زنجیر بن گئی تو اب سرو کو آزاد باندھنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ وہ اب آزاد نہیں رہا۔

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

روکر بھی دیکھ لیا، فریاد بھی کر چکے، دل کے ولولے بھی کام نہیں آئے اور محبوب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایسی مایوسی کے عالم میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مجھ سے تو وہ رام ہوتا نہیں۔ تو ہی اس کا دل پھیر دے تو کچھ بات بنے۔

دلربائی زُلف جاناں کی نہیں
پیچ و تاب طرہ شمشاد کیا

شمشاد بھی سرو کی طرح کا ایک درخت ہے۔ طرۂ خم دار حلقہ دار زلفوں اور پگڑی کو بھی کہتے ہیں کہ شمشاد کی پیشانی پر جو لہریے دار کلغی ہے، اس میں میرے محبوب کی زلفوں کی سی دلکشی نہیں ہے۔ میرے محبوب کی زلفوں کو دیکھ کر جلنے اور شمشاد کو پیچ وتاب کھانے کی ضرورت نہیں۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

کہتے ہیں کہ آسمان ستم کرنے کے نئے سے نئے حربے ایجاد کرتا ہے۔ زیادتی دیکھیے کہ میری بدنصیبی کو دیکھ کر اس نے مجھے ستارہ شناسی کا علم دے دیا تاکہ میں اپنے نصیبوں کے برے ستاروں کو دیکھتا رہوں اور پریشان ہوتا رہوں۔

روز محشر کی توقع ہے عبث
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا

حشر کے دن مصائب کا اجرمل جائے گا، اسی امید پر کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ یہ محض خیالی باتیں ہیں۔ اس سے دل خوش نہیں ہوتا۔

گر بہائے خون عاشق ہے وصال
انتقال رحمتِ جلاد کیا

کہتے ہیں کہ جب وصال محبوب کی شرط یہ ٹھہری کہ عاشق کا قتل ہو اور اس کی دیت کی شکل میں وصال محبوب میسر ہو تو پھر تو جلاد سے قتل کا انتقام لینا ایسا ہوا جیسے کوئی رحم کرنے والے سے بدلے کا جذبہ رکھے۔

بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس
لب پہ مومن ہرچہ بادا باد کیا

جنت کا تصور یہ ہے کہ وہاں کسی طرح کی نعمتوں اور عیش پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور بے خوف وخطر زندگی گزرے گی۔ مومن کہتے ہیں کہ بت کدہ دلکشی میں جنت سے کم نہیں ہے۔ اس لیے وہاں جانے میں کسی طرح کے تردد کی ضرورت نہیں۔ خدشات کو دل سے نکال دیجیے۔

دلِ بیتاب کو گر باندھ کر رکھوں نہ ٹھہریگا
سوا اُس در کی زنجیروں کے یہ مجنوں نہ ٹھہریگا

دل جو محبوب کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے اور چین سے کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا، اسے کسی بھی زنجیر سے باندھ دیا جائے وہ ٹھہرنے والا نہیں ہے۔ اس کی تو بس ایک ہی ترکیب ہے کہ محبوب کے دروازہ کی زنجیروں سے باندھ دیا جائے۔

طپش سے خاک میں بھی عاشق مدفوں نہ ٹھہریگا
کہ گنبد قبر کا جوں گنبدِ گردوں نہ ٹھہریگا

عشق کی آگ میں اس قدر گرمی ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی عاشق کو قرار ممکن نہیں۔ مدفن کا گنبد بھی اس کی گرمی سے آسمان کے گنبد کی طرح گھومتا رہے گا۔

نہ ٹھہرا بوسہ تو دینا دلِ مفتوں نہ ٹھہریگا
اگرواں ووں نہ ٹھہریگا تو یاں بھی یوں نہ ٹھہریگا

اپنے شیفتہ وفریفتہ بے چین عاشق کو تسلی سے پُرسکون رہنے کے لیے محبوب بوسے دینے کا لالچ دیتا ہے۔ لیکن وہ کہاں ماننے والا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر عام حالت میں دل بے تاب نہیں ٹھہرتا، تو بوسے کے وعدے کے بعد تو بے چینی اور بھی بڑھ جائے گی۔ ہر دو حالت میں بے چینی دور نہیں ہوگی۔

اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشمِ میگوں کی
کفِ ساقی میں جامِ بادۂ گلگوں نہ ٹھہریگا

اگر شراب فروش بچوں کی شرابی آنکھیں اسی طرح گردش کرتی رہیں گی تو سرخ رنگ کی شراب سے لبریز جام، ساقی کے ہاتھ سے گر جائے گا۔ مخمور آنکھوں کے فیض سے شراب کا جام خود بخود گردش میں آجائے گا۔

مرے خط میں شکایت اُس کی شہبازِ نظر کی
پروبالِ کبوتر ایک اک لکھ دوں نہ ٹھہریگا

میں نے جو محبوب کو خط لکھا ہے، اس میں اس کی نظر کی شکایت ہے جو شہباز کی طرح اُڑتے پرند کو شکار کرتی ہے۔ اس لیے جس کبوتر کے ہاتھ خط کو بھیج رہا ہوں، پہلے ہی لکھ دیتا ہوں کہ اس کا کوئی بازو، کوئی پر سلامت رہنے والا نہیں ہے۔

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوئے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

جس سر کو زانوے جاناں کی عادت پڑ گئی ہو، وہ تکیے پر کیا سکون پا سکتا ہے۔ بے طرح اور جس طرح کے الفاظ کے استعمال میں زیادہ زبان کا چٹخارہ لیجیے۔

سراپا بسکہ محوِ شوخیِ قاتل ہوں محشر تک
مرے زخموں سے جاری ہی رہے گا خوں نہ ٹھہرے گا

اپنے قاتل کی شوخی میں سر سے پیر تک اس قدر کھویا ہوا ہوں کہ میرے زخموں سے رسنے والا خون قیامت تک جاری رہے گا۔ پہلے مصرع کا ٹکڑا محشر تک، دوسرے مصرع کے ساتھ پڑھنے سے معنی دیتا ہے۔ پہلے مصرع کے مضمون سے اسے کوئی ربط نہیں۔ یہ عیب مومن کے یہاں اکثر ملتا ہے۔

کیا بہر عیادت گر ارادہ اُس نے آنے کا
تو جب تک جان ہے دردِ دلِ محزوں نہ ٹھہرے گا

اگر محبوب بیمار پرسی کے لیے آنے کا ارادہ کر بھی لے، تو درد میں کمی ہونے والی نہیں، اس کے آنے کے ارادے سے درِ دل کم ہونے والا نہیں۔

ہوئی تاثیر گر تھوڑی سی بھی اُس سرو موزوں کو
زمیں کیا آسماں پر نالۂ موزوں نہ ٹھہرے گا

میرے خوبصورت سرو قد محبوب پر اگر میرے نالوں کا تھوڑا بھی اثر ہوا، تو مجھے یقین ہے کہ زمین تو پھر زمین ہے، آسماں پر بھی میرے نالے نہیں ٹھہریں گے۔ یعنی اپنی پُر اثری پر اتنے مغرور ہو جائیں گے کہ ان کا دماغ آسمان کی بلندی کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔ محبوب کا سر اور آسماں میں بلندی مشترک ہے۔

مہِ نو بن گئے ہم طولِ شبہائے جدائی سے
کہاں تک دیکھیے وہ حُسن روز افزوں نہ ٹھہریگا

جدائی کی لمبی راتوں کو جھیلتے جھیلتے ہم ہلال کی طرح کمزور ہو گئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا محبوب، جس کے حسن میں چاند کی طرح روز اضافہ ہوتا ہے، وہ کہاں جا کر رکے گا۔ اور ہماری جدائی کی راتیں کب ختم ہوں گی۔ چاند کی چال یہ ہے کہ وہ چاندرات کے بعد چودہ دن تک بڑھتا ہے اور پھر گھٹنے لگتا ہے۔ ہر پہلی رات کے بعد دوسری رات کو دیر سے اٹھتا ہے اور چھبیس تاریخ تک صرف ہلال کی طرح چھوٹا رہ جاتا ہے اور تھوڑی دیر دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر دو دن کے لیے پھر غائب ہو جاتا ہے۔

وہ شاعر ہوں کہ باندھوں گا خمِ زنجیر کاکل سے
اگر دل کے قلق کے دھیان میں مضمون نہ ٹھہرے گا

اگر غم میں مبتلا ہونے کے سبب مجھے فکر شعر میں کوئی مضمون بجھائی نہ دے گا تو میں مضمون کو یار کی زلفوں کی زنجیر میں باندھوں گا۔

طوافِ کعبہ کا خوگر ہے دیکھو صدقے ہونے دو
بتو سمجھو ذرا مومن ہے مومن یوں نہ ٹھہرے گا

اے حسینو! میں مومن ہوں، جسے کعبہ کا طواف کرنے کی عادت ہے۔ لہٰذا مجھے اپنے اوپر نچھاور ہونے دو اسے۔ محبوب پر صدقے ہونا مومن کا ایمان ہوتا ہے۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اس شعر کا دوسرا مصرعہ اس قدر برجستہ اور مکمل ہے کہ یہ بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ظلم و ستم اور بے اعتنائی کا الزام لگا رہے تھے کہ اس نے یہ کہہ کر ہماری ساری شکایتوں کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ ہم کو موردِ الزام قرار دیا کہ جو کچھ کیا، وہ دراصل ہمارے جذبِ دل کا امتحان تھا جس میں ہم ثابت قدمی کا ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ مصرع بتاتا ہے کہ مومن کو پہلے سے اندازہ بھی نہ تھا کہ اس مقدمہ میں انھیں کو مات ہو جائے گی۔

نہ شادی مرگ ہو کیونکر ہے مژدہ قتل دشمن کا
کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

محبوب کو ہاتھ میں تلوار لیے اور روتا ہوا گھر سے باہر آتے دیکھ کر عاشق یہ قیاس کرتا ہے کہ اس نے رقیب کو قتل کر دیا ہے۔ اس لیے اسے دشمن کی موت کی خوشخبری پر محمول کرتے ہوئے خوشی کا موقع سمجھتا ہے۔

ستم اے گرمیِ ضبطِ فغاں و آہ چھاتی پر
کبھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا

آہ و نالہ کو ضبط کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گرمی جھیلنے میں کبھی چھالے اور کبھی پھوڑے کی صورت ظاہر ہوئی۔ اس شعر میں بھی '' چھاتی پر'' کا فقرہ دوسرے مصرع کے ساتھ لگا کے پڑھیں گے جب بات پوری ہوگی۔

کیا زنجیر مجھ کو چارہ گر نے کن دنوں میں جب
عدد کی قید سے وہ شوخ بے پروا نکل آیا

چارہ گر نے ان دنوں زنجیر میں باندھا جب میرا محبوب رقیب کی قید سے بے پروا ہو کر نکل بھاگا۔ گویا میرا چارہ گر در حقیقت چارہ گر نہ تھا بلکہ صاف غیر کا طرف دار تھا۔ اس کی چارہ گری میرے حق میں نہیں تھی۔

نِکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نِکال آنکھیں
سُنا معذور ہے مضطر نِکل آیا نکل آیا

میری آنکھ سے آنسو کا نکل آنا ایک اضطراری عمل تھا، نہ کہ قصداً۔ اس پر اس طرح جز بز ہونے، غصہ کرنے کا مقام نہیں ہے۔ اضطراری طور پر سرزد ہونے والے عمل میں آدمی کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ آنسو معذور تھا نکل آیا تو نکل آیا، کوئی کیا کر سکتا ہے۔

ہمارے خوں بہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو
یہ بعد انفصال اب اور ہی جھگڑا نِکل آیا

ہم قتل ہو گئے تو سمجھا کہ چلو قصہ تمام ہوا اور کوئی جھگڑا باقی نہیں رہا۔ لیکن اب یہ نیا مقدمہ شروع ہو گیا کہ ہمارا قاتل ہمارے خون بہا کا دعویٰ ہمارے رقیب پر کر رہا ہے کہ اس کی ایما پر میرا قتل ہوا، ورنہ سیدھی بات تو یہ ہے کہ دیت قاتل پر واجب ہوئی ہے۔

ہوئی بلبل ثنا خوانِ دہانِ تنگ کس گُل کی
کہ فروردی میں غنچہ کا مُنھ اتنا سا نِکل آیا

اتنا سا منہ نکل آنا، پریشانی یا شرمندگی کے آثار چہرے سے ظاہر ہونے کا محاورہ ہے۔ فروردین ایرانی سال کا پہلا مہینہ ہوتا ہے اور وہ بہار کا مہینہ ہے۔ محبوب کے دہان کی تنگی اس کے حسن کی علامت ہے۔ کہتا ہے کہ بلبل نے ایسے کس پھول کی دہان تنگ یعنی غنچہ دہنی کی تعریف کی ہے کہ بہار کے مہینے میں کلی کا منہ غم کے مارے اتنا سا ہو گیا ہے۔ گل محبوب کا استعارہ ہے۔ موسم بہار کے

سارے تلازمے بلبل کی چہکار، گل، فروردین، غنچوں کا نکلنا یا کلیوں کا آنا، سب کچھ اس شعر میں اکٹھا ہو گئے ہیں۔

کوئی تیر اُس کا دل میں رہ گیا تھا کیا کہ آنکھوں سے
ابھی رونے میں اک پیکان کا ٹکڑا نکل آیا

کہتے ہیں کہ میں رو رہا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ تیر کی نوک کا ایک ٹکڑا بھی باہر آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کا مارا ہوا کوئی تیر دل کے اندر رہ گیا تھا۔

دم بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو
کہ ہر زخمِ بدن سے خون کا دریا نکل آیا

کہتے ہیں کہ ذبح ہوتے وقت ہم کو تکلیف ہونا اور اِس تکلیف میں ہمارے آنسو نکلنا ایک فطری عمل تھا، مگر ہم نے کسی خوف سے آنسو ضبط کر لیے، نتیجہ کہ اب ہر دہان زخم سے خون دریا کی طرح بہہ نکلا ہے۔ جانور کو جب ذبح کیا جاتا ہے تو بسم اللہ پڑھ کر چھری پھیری جاتی ہے۔ اس لیے اس کو بسمل کہا جاتا ہے۔ وقت ذبح اللہ کا نام لیا گیا تو اس کے خوف سے آنسو نہ پیے جاتے تو راضی برضا نہ ہونے کا گناہ لازم آتا۔

خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارماں ایک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

سینے سے دوست کا تیر باہر نکلنے کے ساتھ ہی مقتول کی جان بھی نکل گئی۔ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو یہی تھی جواب پوری ہو گئی۔ ارمان کا نکلنا۔ نکل جانا تو سنا بھی پڑھا بھی، لیکن نکل آنا نہ کہیں سنا نہ پڑھا۔ یہ روزمرہ کے خلاف لگتا ہے۔

بہت نازاں ہے تو اے قیس پر وحشت دکھاؤں گا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

کہتے ہیں کہ مومن کی وحشت ایسی ہے کہ جس کے سامنے قیس کی دیوانگی کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر کسی کتاب میں اس کے عالم وحشت کا تذکرہ قلم بند کیا جائے اور وہ سامنے آئے تو تو قیس کو شرمندگی کا سامنا کرنے پڑے۔

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

کہتے ہیں کہ جب قیامت کے دن یعنی روزِ حساب، میں نے اپنے قاتل کو دلجو یعنی شفیق یا مہربان کے نام سے مخاطب کیا، تو یہ الفاظ خود ہی میرے سوال کا جواب ہو گئے اور اس کے خلاف میرے قتل کا کوئی جواز نہیں رہا۔

ناصح ہے طعنہ زن مری ناکامیوں پہ کیا
دلجوئیوں سے تیری کبھی کامیاب تھا

یہ ناصح جو آج میری ناکامیوں پر طعنہ زنی کر رہا ہے، وہ اپنے بارے میں غور کرے کہ وہ خود تیری مہربانیوں کی وجہ سے کامیاب ہو گیا تھا۔ یعنی کامیابی کا دارومدار محبوب کی مہربانی پر ہے۔

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سُو رہے
آرام شکوۂ ستمِ اضطراب تھا

محبوب نے شام کو ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم کو انتظار کی بے چینی نے ٹھہرنے نہیں دیا اور ادھر اُدھر مضطربانہ آوارہ گردی کرتے پھرے۔ نتیجے میں تھکن اس قدر بڑھی کہ وعدہ کی شام ہم کو نیند آ گئی۔ اب شکایت محبوب کی نہیں، بلکہ ہمارا آرام خود اضطراب کے ستم کا شکوہ کر رہا ہے، کہ نہ بے چینی میں تھکتے، نہ آرام کا موقع ہوتا۔

کیا کیا شِکن دیے ہیں دل آزار کو مگر
اُس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا

بے چینی کی کیفیت میں ہم دلِ آزار کو توڑتے مروڑتے رہے۔ شاید وہ وہی ورق تھا جو اس کے نزدیک سب سے اچھا تھا۔ یعنی محبوب کو ہماری دل آزاری ہی پسند ہے۔

عاشق ہوئے آپ کہیں گو اُسی پہ ہوں
شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا

کل رات میں نے دیکھا کہ رقیب کی حالت مجھ سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ لگتا ہے کہ آپ کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ رقیب کی حالت زیادہ خراب ہونے سے نفسیاتی طور پر عاشق کو تھوڑا طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ رقیب کو بھی یہ یقین نہیں ہے کہ محبوب اسی پر عاشق ہوا ہے۔

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں کیا
یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج وعذاب تھا

جاتے جاتے بھی مجھے رنجیدہ کرنا کیا ضرور تھا۔ میں تو ہجر میں یوں بھی عذاب میں مبتلا رہا کرتا ہوں۔

وہ چشم انتظار کہاں باز بعد مرگ
دیکھا تو ہم نے آنکھ لگنا بھی خواب تھا

مرنے کے بعد انتظار کی آنکھیں کہاں کھلی رہتی ہیں۔ یہ بات مرنے کے بعد دیکھی کہ آنکھیں بند نہ ہوں تب بھی نیند آتی ہے۔

بے پردا غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح نہ ہُوا ہوگا
آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا

وصل کی شب غیر کے ساتھ بسر کرنے کے بعد محبوب کو غیر معمولی طور پر کسی طرح کے شرم ولحاظ کے بغیر دیکھ کر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ بے پردا، نہ ہوا ہوگا۔

دیکھا نہ ہے یہ رشک وحسد وہ بلا کہ آج
سنبل کو تیری زلف کا سا پیچ وتاب تھا

اس عشق کی جادوگریوں نے حیرت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کبھی یہ شعلہ بن کر دل کو جلاتا ہے، تو کبھی آنکھوں میں آنسو بن جاتا ہے۔ اس خاکسار کا یہ شعر اسی مطلب کا ہے۔

یہ بھی کیا کہ بارہا پھونک دیے دل وجگر
یہ بھی ہوا کہ غم کی آگ اشک بنی ٹپک گئی

☆

ہوں کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگہائے شوق
جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

کہتے ہیں کہ آج ناصح کی گفتگو میں میرا دل خوب لگا کیونکہ اس میں محبوب کا تذکرہ تھا۔ میں اب تک بے کار ہی اس سے بچتا تھا۔ پہلے مصرع کا عبث یہاں بھی دوسرے مصرع کے ساتھ بامعنی ہوتا ہے۔ مومن کے یہاں ایسا بہت ہوتا ہے اور لطف بیان میں کمی کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کی

چیزیں کبھی کبھی بڑاستم ڈھاتی ہیں، اور مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

عجیب طرفہ تماشا رہے اگر گردن
کوئی ملول کی اس رہگزار میں مارے

گردن کے بغیر اب دوسرا مصرع پڑھیے اور غور کیجیے۔

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا
یا مرے اضطراب نے مارا

محبوب کا غصہ یا عتاب بھی تکلیف دہ ہے اور اپنا اضطراب بھی۔ دونوں چیزیں جان لیوا ہیں۔ فیصلہ مشکل ہے کہ ہمارے مرنے کا سبب ان میں سے کون سی بات ہے۔

بزم مے میں بس ایک میں محروم
آپ کے اجتناب نے مارا

شکوہ کرتے ہیں کہ محفل میں ساقی سب کو پلا رہا ہے لیکن انھیں جام نہیں دیتا، اس کا یہ امتیازی طور پر ہم سے گریز، مار ڈالنے کے مترادف ہے۔

لے کے دل بھی کجی نہیں جاتی
زُلف کے پیچ و تاب نے مارا

دل لے کر ہمارے معاملے میں سیدھا سچا سلوک کرنا چاہیے تھا، لیکن اس کی ٹیڑھی چال میں زلفوں کے پیچ وتاب کی طرح کوئی کمی نہیں ہے۔

کیا پسند آئی اپنی جور کشی
چرخ کے انتخاب نے مارا

کہتے ہیں کہ آسمان نے مظالم کرنے کے لیے تختہ مشق کے طور پر ہمیں ہی منتخب کیا، کیونکہ اسے ہماری قوت برداشت پسند آئی۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند والی بات ہے۔

۵۔ آرام اور نیند ہمارے اوپر حرام ہو گئے ہیں، اگر اسی حال میں مر کر دفن ہو گئے تو روز محشر خاک سے کیا خاک اٹھیں گے۔ یعنی اٹھنا مشکل ہے۔ جب قبر میں بھی نیند اور آرام نہیں

ملے گا تو اٹھنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اٹھایا تو اسے جاتا ہے جو سویا ہوا ہو یا آرام کر رہا ہو۔

تشنہ کامی وصال کی مت پوچھ
شوقِ تیغِ خوش آب نے مارا

قاتل کی بہترین دھاردار تلوار کے شوق میں ہی جان نکل گئی تو وصال کی حسرت تشنہ کی تشنہ ہی رہ گئی۔

خون کیونکر مرا کُھلے کہ مجھے
اِک سراپا حجاب نے مارا

میرے قاتل کی پہچان ممکن نہیں کیونکہ میرا قاتل سر سے پیر تک پردہ میں رہتا ہے۔

یاد ایام وصلِ یار افسوس
دہر کے انقلاب نے مارا۔

ایک زمانہ تھا کہ وصال یار میسر تھا۔ اچھے دن تھے، لیکن زمانہ تغیر پذیر ہے۔ اب اس زمانے کی یاد آتی ہے تو مار کر رکھ دیتی ہے۔

لب میگوں پہ جان دیتے ہیں
ہمیں شوقِ شراب نے مارا

ساقی کے شراب رنگ سرخ ہونٹوں کے دل دادہ ہیں، ہمیں شراب کے اس شوق نے مار رکھا ہے۔

جبہ سائی کا بھی نہیں مقدور
اُن کی عالی جناب نے مارا

محبوب کی بارگاہ اتنی اونچی ہے کہ اس کے در پہ پیشانی رگڑنے کی قدرت بھی ہمیں نہیں۔

نازک اندام سے لگی ہے آنکھ
حسرتِ فرش خواب نے مارا

ہماری حسرت تھی کہ ہم اس نازک اندام کے خواب کا بستر ہوتے، جس پر وہ آرام کی نیند سوتا۔ لیکن یہ ایک امر محال ہے۔ اسی غم میں مر جائیں گے۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھے فکرِ جواب نے مارا

محبوب مجھ سے بھی سوال کرتا ہے کہ میں کس پر جان دیتا ہوں۔ مجھے یہ فکر مارے دیتی ہے کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔ یعنی اس کو یا تو معلوم نہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، اگر کہوں تو ناراض نہ ہو جائے۔

یوں کبھی نو جواں نہ مرتا میں
تیرے عہدِ شباب نے مارا

نوجوانی میں موت آنا عموماً کم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرا عہد شباب میری جوانی میں موت کا سبب ہے۔ یعنی وہ جوانی کیا جس میں کسی حسینہ سے عشق نہ کیا جائے۔ یہاں اسی مضمون کا ایک شعر یاد آتا ہے جو زیادہ واضح ہے۔ کہا ہے کہ

اس کے عہد شباب میں جینا
جینے والو تمھیں ہُوا کیا ہے

☆

مومن از بس ہیں بے شمار گناہ
غم روزِ حساب نے مارا

مومن، میں اس قدر بڑا گناہ گار ہوں۔ میں نے اتنے گناہ کیے ہیں کہ جن کا شمار ممکن نہیں ہے۔ میں روز حساب کی فکر میں گھلا جاتا ہوں کہ کس طرح حساب دے سکوں گا۔ دوسرے یہ کہ میرا کیا حشر ہوگا۔ میں کیا جواب دوں گا۔ مومن کو دیکھیے کہ وہ وہ تو بے شمار گناہوں کی حساب دہی اور اپنے حشر سے خوفزدہ ہیں، دوسری طرف غالب ہیں کہ وہ داورِ محشر کو ٹکا سا جواب دیتے ہیں اور خود اسی پر سوال جڑ دیتے ہیں۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

دیکھ کر شوق ناتمام مرا
غیر لے جائے ہے پیام مرا

میں کسی رقیب کے ہاتھ محبوب کو پیغام بھیجتا ہوں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی میری

محبت میں کمی ہے۔ یعنی مجھے اپنے سے زیادہ دوسرے پر اعتماد ہے۔ اس معاملہ میں غالب کا شعر زیادہ واضح ہے اور پُر لطف ہے۔ سنورا ہوا ہے۔

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہ بزرگ ایک دوسرے کے اشعار دیکھ کر شعر کہا کرتے تھے۔

آتشیں خو سے آرزوئے وصال
پک گیا آب خیالِ خام مرا

گرم مزاج محبوب سے وصال کی تمنا خام خیالی تھی، جو تجربے کے بعد پختہ ہوگئی۔ گرمی سے خیال بھی پک گیا۔

رُتبہ اُفتادگی کا دیکھو ہے
عرش کے بھی پرے مقام مرا

خاکساری سے یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ میرے درجات آسمان کی بلندی سے بھی اوپر پہنچ گئے۔

کِس صنم کو چُھڑا دیا واعظ
لے خُدا تجھ سے انتقام مرا

اس میں کوسنا ہے، بددعا ہے۔

ہو کے یوسف جو دل چُراتے ہو
کون ہوجائے گا غلام مرا

حضرت یوسف کو غلام بنا کر اپنے پاس رکھنے کے لیے ان کی پھوپی نے ان پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ حضرت یوسف نے بھی اپنے بھائی بن یامین کو روک رکھنے کے لیے ان پر چوری کا الزام لگایا تھا، کہتے ہیں تم تو خود یوسف ہو، تم جو میرا دل چراتے ہو تو تم کیا میرے غلام ہونے کو تیار ہو۔ حسب قاعدہ تم کو میرا غلام ہونا پڑے گا۔

تو نے رسوا کیا مجھے اب تک
کوئی بھی جانتا تھا نہ نام مرا

یعنی اب تک تو کوئی میرے نام سے واقف نہیں تھا۔ تجھ سے محبت کر کے میں بدنام ہو گیا۔

زنوائے بُت پہ جان دی دیکھا
مومن انجام و اختتام مرا
بندگی کام آ رہی آخر
میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

قطعہ بند شعر ہیں۔ محبوب کے زانو پر سر ہو اور موت آ جائے تو اس سے زیادہ بہتر انجام کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس بت کی بندگی میں زندگی گزار دی تھی، یہ اسی کا انعام تھا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہی بندگی ایک دن رنگ لائے گی۔ لو سلام میرا کہا پورا ہوا۔ بندگی اور سلام میں رعایت لفظی ہے۔

نازِ بیجا سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا
غیر پر ظلم کیے میرے مقابل نہ ہوا

محبوب اپنے ناز نخرے میں غرق رہا، اور ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اپنے ظلم کا کاروبار غیر کے ساتھ جاری رکھا۔ مجھ پر ظلم نہ کر پانا اس کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔ مومن چاہتے تھے کہ وہ اس پر ظلم کرتا، اس لیے وہ شرمندگی کا طعنہ دے کر اپنے اوپر ظلم کرنے کو اکساتے ہیں۔

خود گلا کاٹ مُوا جب کہ میں بسمل نہ ہوا
اُن کو آساں نہ ہوا جو مجھے مشکل نہ ہوا

محبوب نے عاشق کو قتل نہیں کیا۔ وہ قتل کرتا تو بسمل کہلانے کا حق دار ہوتا۔ عاشق نے خود اپنا گلا کاٹ لیا۔ کہتا ہے کہ جو کام میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہو، امحبوب کے لیے آسان نہ ہو سکا۔

کس طرح بزم میں وہ آنکھ چُراتے مجھ سے
دل کو کھو کر یہ ڈراتا تھا کہ میں غافل نہ ہوا

چوری اس کی کی جاتی ہے جو غفلت میں ہو۔ اس لیے محبوب آنکھ نہیں چرا سکا۔

خوں چھپانے کو مری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ
مجھ کو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا

قتل کے الزام سے بچنے کا اچھا طریقہ ہے۔

یاد کاکل میں بھی خود رفتگی اپنی نہ گئی
جوشِ وحشت سے میں پابند سلاسل نہ ہوا

۵۔ جب خودوارفتگی ہواور ہوش ہی نہ رہے، تو زنجیر کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

☆☆☆

انجم عثمانی

شرح اشعار مومن

وصل کی شب۔ شام سے میں سوگیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہوگیا

ملنے کی رات کے انتظار میں اتنا جاگا کہ جب ملنے کی رات، وصل کی شب آئی تو رات سے پہلے ہی شام کو ہی سوگیا۔ سہلِ ممتنع کے اس شعر میں اردو میں عاشق کے روایتی کردار اور صفات کے مطابق ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ ''وصل کی شب'' سے پہلے ''ہجر'' اتنا طویل تھا کہ ''وصل کی شب'' آتے آتے عاشق ''شام'' سے ہی سوگیا۔ گویا جس رات کے انتظار میں جاگ جاگ کر راتیں کاٹیں، اس رات کے آنے سے پہلے ہی شام کو سوگیا۔ وصل کی شب میں شام کو ہی سوجانے سے ایک نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہجراں جسے ''وصل کی شب'' ختم کرسکتی تھی، وہ اور طویل ہوگیا کیوں کہ اب وصل کی شب کب آئے گی اس کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ یعنی ہجر جاری ہے۔

دل نہ پھرا جان ہی ٹھہرے خدا
یہ تو نہ جائے کہیں وہ تو گیا

دل جو اس کے (معشوق کے) پاس گیا تھا، وہ تو لوٹ کر نہیں آیا، جان رہ گئی ہے، خدا کرے یہ تو رہ جائے۔ اس بظاہر سادہ سے شعر کے لہجے میں کئی خوبصورت اور گہرے نکتے ہیں۔ دل نہ پھرا'' (لوٹ کر نہیں آیا) لہجہ ایسا ہے جیسے ''لوٹ کر آنے کے لیے'' کہہ کر گیا ہو اور نہ آیا ہو۔ یا وہ (معشوق) لے گیا تھا (واپسی کی شرط پر) مگر لوٹایا نہیں (اس سے معشوق کی دل سے کھیلنے کے ساتھ ایک اور صفت وعدہ خلافی کا ہلکا سا پہلو بھی نکلتا ہے۔ پھر یہ کہ دل لوٹانے آئے گا تو وصل کا موقع نکلے گا اور وصل اسے منظور نہیں، اس لیے لوٹانے نہیں آیا) یا ''دل'' میرا تھا وہ اس پر ایسا فدا ہوا کہ لوٹ کر نہیں آیا، پھر'' جان ہی

ٹھہرے'' جو ایسا ہی لہجہ ہے جیسے یہ جو دل کی طرح جانے کو بضد ہے، گویا معشوق ایسا پر کشش ہے کہ دل گیا تو اس کے ساتھ ایسا محو ہوا کہ لوٹ کر نہیں آیا اور اب جان بھی بضد ہے۔ کم از کم یہ تو ٹھہر جائے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ ''تو'' بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے جو پچھلی سطروں میں بیان ہوا۔ اس دوسرے میں لفظ ''کہیں'' مصرعہ کا سب سے اہم لفظ ہے کہیں پتہ نہیں کہاں (اگر پتہ ہوتا تو لفظ وہاں ہوتا) یعنی نہ تو دل کا پتہ ہے کہ وہ کہاں گیا۔ ''کہیں'' میں ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ دل کا تو پتہ ہے کہ وہ اس کے پاس گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا مگر یہ جان تو کہیں نہ جائے۔ یہیں سے کہیں اور کا شائبہ بھی ہے۔ سادہ سے شعر کی خوبی یہی ہے کہ اس میں لطف کے کئی پہلو ہیں۔

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا

''ہاتھ سے دیکھو گیا'' میں دونوں پہلو ہیں، یعنی ''ہاتھ سے گیا'' اور ہاتھ سے دیکھو' یعنی چھو کر دیکھو دل گیا۔ پھر آئینہ پٹکو دو گے تو ہاتھ خالی ہو گا اور ہاتھ خالی ہو گا تبھی تو ہاتھ سے دیکھو گے کہ دل گیا۔

ہوں میں سیہ رُو نہ کہ وہ شمع رُو
شام کو آیا تھا سحر کو گیا

سیہ رو اور شمع رو میں شام اور سحر کی رعایت ہے۔ میں سیہ رو ہوں، وہ شمع رو نہیں ہے۔

طالع برگشتہ میرے کیا پھریں
ملک عدم سے نہ پھرا جو گیا

میرا برگشتہ مقدر اب لوٹ کے آنے والا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو ملک عدم چلا گیا، یعنی دنیا سے چلا گیا اور ملک عدم کو جو جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا ہے۔

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ
آ کے مری نعش پہ وہ رو گیا

جنازے کے ساتھ روتے ہوئے چلنا منع ہے، اس لیے وہ مکر سے میری نعش پر آ کر رو گیا، تا کہ ساتھ نہ چلنا پڑے۔

شوخی قاتل کے میں قربان ہوں
کہتے رہے سب یہ گیا وہ گیا

شوخی قاتل یہ ہے کہ سب کے سامنے قتل کیا اور اس طرح گیا کہ سب کہتے رہ گئے، یہ گیا وہ گیا۔ یہ گیا وہ گیا کی وجہ سے مصرعہ میں وہ حرکت اور عمل در آیا ہے جو شوخی کے مطابق ہے۔ پھر اس نے یہ سب کچھ ایسی صفائی سے نہیں کیا کہ نہ صرف سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، بلکہ عاشق کو قتل کی ادا میں جو شوخی ہے، اس پر قربان ہو رہا ہے۔

صبر نہیں شام فراق آ چکو
جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا

اب صبر نہیں ہوتا۔ شام فراق گزر گئی جس سے تم بیزار تھے، وہ سو گیا۔ اب تو آ جاؤ۔

شکر اثر تھا گلہ دشمناں
نالہ مرے کام سے یارو گیا

دشمنوں کو گلہ تھا کہ مرے نالے میں اثر ہے، ان کا گلہ کام آیا، میرا نالہ مرے کام سے گیا یعنی کام نہیں آیا۔

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہو گیا

مومن تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ہائے صنم ہائے صنم کر رہے ہو، جب کہ تم ایسے نہ تھے۔

ڈر مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں ڈر کی وجہ سے خاموش نہیں ہوں بلکہ اس لیے کچھ نہیں کہتا کہ میرا حال سب پہ افشا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا، اس لیے کہ جو ظاہر ہے اسے کیا بتانا اور میں کچھ نہیں کہتا، یہ بھی سب پر ظاہر یعنی میرا کچھ نہ کہنا بھی سب جانتے ہیں۔

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناصح تجھے گلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے کیوں کہ تو میری کب سنتا ہے کہ میں تیری سنوں،

اور ناصح تو جب میری سنتا ہی نہیں تو تجھے کیا پتہ کہ میں کچھ کہتا ہوں یا نہیں کہتا ہوں، اس لیے یہ گلہ کیا ہے یعنی فضول ہے۔

میں بولوں تو چپ ہوتے ہیں اب آپ جبھی تک
یہ رنجش بے جا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

آپ کی یہ رنجش بے جا ہے کیوں کہ جب میں بولوں تب آپ چپ رہتے ہیں اور نہیں بول رہا ہوں تو کہتے ہیں کہ کچھ نہیں کہتا۔

کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے یہ جو پوچھو
تو وہیں مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

غیر سے ہونٹوں ہونٹوں میں کچھ کہتا ہے اور اگر پوچھا یہ کیا ہے، تو مکر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ نہیں میں تو کچھ نہیں کہتا۔

کب پاس پھٹکنے دوں رقیبوں کو تمھارے
یہ پاس تمھارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یہ رقیب جو تمھارے آس پاس رہتے ہیں، مجھ میں اتنا زور ہے کہ میں چاہوں تو تمھارے آس پاس بھی ان کو پھٹکنے نہ دوں۔ مگر مجھے تمھارا پاس ہے اس لیے کچھ نہیں کہتا۔

ناصح کو جو چاہوں ابھی ٹھیک بنادوں
پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

''ناصح'' کو اس لیے ٹھیک نہیں بناتا ہوں کہ خوف خدا ہے اور رقیبوں کو تمھارا پاس ہے اس لیے کچھ نہیں کہتا۔ دونوں شعر ایک ہی موڈ کے ہیں۔

کیا کیا نہ کہے غیر کی گر بات نہ پوچھو
یہ حوصلہ میرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اگر میں غیر کے بارے میں نہ پوچھوں تو نہ جانے کیا کہے(کیوں کہ اسے غیر سے دلچسپی ہے) یہ میرا حوصلہ ہے کہ میں چپ ہوں۔

کیا کہیے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ
سن سن کے وہ چپکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ایسے نصیبوں کو کیا کہیے کہ اغیار کا شکوہ سن سن کے بھی وہ خاموش ہے۔

مت پوچھو کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کہ کیا ہے میں کچھ نہیں کہتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ہے اس کی وجہ کے بیان سے میں قاصر ہوں۔

چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں کچھ نہیں کہتا اس لیے تیرے گھر والے تیرے چپکے سے سامنے کا چرچا کرتے ہیں۔

خاص واردات کا شعر ہے۔ یہ بھی اور اس سے پہلا شعر بھی۔

مومن کے شارحین میں سے حامد حسن قادری نے ان دونوں اور اس قسم کے دیگر اشعار کو مومن کی خاص واردات کے اشعار کہا ہے۔

اے چارہ گر قابلِ درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یہ ایسا درد ہے جس کا کوئی درماں، کوئی علاج نہیں ہے، اس لیے چارہ گر، میں اس درد کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، ورنہ مجھے کوئی سودا ہے کہ درد ہے اور چارہ گر سے کچھ نہ کہوں۔

ہر وقت ہے دشنام ہر اک بات میں طعنہ
پھر اس پہ بھی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ایک تو ہر وقت دشنام اور ہر بات میں طعنہ دیتے ہو اور پھر یہ بھی کہتے ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا۔

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

سب کچھ سن کے بھی جو میں کچھ نہیں کہتا کیا یہ کم ہے۔ اس سے پہلا اور یہ شعر ایک سے مزاج کے شعر ہیں۔

سنتا نہیں وہ ورنہ یہ سرگوشیِ اغیار
کیا مجھ کو گوارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اس غزل میں تقریباً اسی مضمون کا مصرعہ ''کچھ غیر سے ہونٹوں میں کہے ہے جو یہ پوچھو''

پہلے آچکا، اس شعر میں پوچھنے پر وہ مکر جاتا ہے، اس شعر میں کہا ہے کہ یہ سرگوشیِ اغیار مجھ کو گوارا نہیں ہے مگر اسی لیے کچھ نہیں کہتا کیوں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یہ جو ہر ایک اپنی جادو بیانی کا دعویٰ کر رہا ہے، یہ بس اسی وقت تک ہے جب تک میں کچھ نہیں کہتا۔ یہ تعلّی ہے جسے شعرا اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں اور مومن تو یوں بھی آسانی سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ تعلّی ان کے بہت سے اشعار میں موجود ہے مگر ان کی سحر بیانی کی وجہ سے وہ بری نہیں لگتی۔

رات کس کس طرح کہا نہ رہا
نہ رہا پر وہ مہ لقا نہ رہا

اس شعر میں رات کی مناسبت سے مہ لقا خوب ہے۔ چاند سے رات کا تعلق ظاہر ہے۔

غیر آکر قریب خانہ رہا
شوق اب ترے آنے کا نہ رہا

ترے آنے کا جو شوق مجھے تھا وہ اب نہیں رہا، اس لیے کہ غیر بھی قریب خانہ رہنے لگا ہے۔ غیر کے قریب خانہ رہنے سے اس کے آنے کا شوق نہ رہنے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تو آئے گا تو غیر جو قریب خانہ رہنے لگا ہے، ہوسکتا ہے تو وہاں بھی جائے یا پھر کیونکہ غیر قریب خانہ رہنے لگا ہے، تو تجھے وہ آتے دیکھ لے گا اور یہ دونوں باتیں مجھے گوارا نہیں۔

تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

بہت ہی خوبصورت شعر ہے۔ تیرے پردہ کرنے کی وجہ سے سب کو سب کچھ معلوم ہوگیا۔ تیرے چھپتے ہی سب پر سب کچھ ظاہر ہوگیا۔

غم مرا کس لیے کہ دنیا میں
نہ رہا میں مرا فسانہ رہا

میں دنیا میں نہیں تو کس لیے غم ہے، میں نہیں رہا مگر میرا افسانہ تو رہا۔

مدعا غیر سے کہا تھا وہ
سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا

یہ انتہائی مایوسی اور بیکسی کا وقت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دشمن سے اپنا حال کہہ دے اور جب غیر سے کہہ دیا تو اب بات ہی کیا رہ گئی۔ مجھے ایک پہلو اور لگتا ہے کہ اس نے (معشوق نے) مدعا غیر سے کہا۔ کہنا تو مجھ سے چاہیے تھا۔ اب ہم یہ سمجھے کہ اب ہمارا مدعا کچھ بھی نہ رہا۔

کسی کی زلفوں کا دھواں تھا کہ میں شب
محو دودِ چراغ خانہ رہا

غیر چھڑکے ہے زخم دل پہ نمک
شور الفت میں بھی مزا نہ رہا

زخم دل کیوں کہ اس کا (معشوق کا) دیا ہوا ہے، اس لیے یہ بھی گوارا نہیں کہ اس پہ کوئی اور نمک بھی چھڑکے۔ زخموں پر نمک پاشی سے جو شور الفت تھا، اس کا مزہ بھی جبھی تک ہے جب، جس نے زخم دیے ہیں نمک بھی وہی چھڑکے۔ شور بھی نمک ہوتا ہے، اس سے کیفیت میں اضافہ ہوگیا۔

پہنچے وہ لوگ رتبہ کو کہ مجھے
شکوۂ بختِ نارسا نہ رہا

ایسے ایسے لوگوں کو مراتب حاصل ہو رہے ہیں کہ مجھے کوئی رتبہ حاصل نہ ہونے پر اپنے مقدر سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔

تلخ کامی نصیب اعدا حیف
جب کہ وہ اپنے کام کا نہ رہا

تلخ کامی اور دشمنوں کا نصیب اس کا اب کیا افسوس، جب میرے کام کا ہی نہ رہا۔

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

دل اگر نہیں رہا تو کیا، دل لگانے کا مزہ تو اٹھا لیا۔

تو فلک مرگ ہم سے سب غافل
اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

فلک مرگ ہم سے اور سب تو غافل ہی ہیں، ایک ترا آسرا تھا مگر تو بھی ہم سے غافل ہے۔

مومن اس بت کے نیم ناز ہی ہیں
تم کو دعویٰ اتقا نہ رہا

یہاں مومن تخلص کے علاوہ عام معنوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

عشق میں چاک میرے گریباں کو تو بار بار ٹانکے لگوا کے سلواتا ہے۔ بس بہت ہو گیا۔ ہاتھ کٹواؤں اگر اب ایک تار جو گریباں کا رہ جائے۔ ''ہاتھ کٹواؤں'' میرے خیال میں دونوں طرف ہے، یعنی اب گریباں ایسا چاک کروں گا کہ ایک تار بھی نہ بچے گا، اگر رہ گیا تو اپنے ہاتھ کٹوا دوں گا، یا تیرے یعنی ناصح کے ہاتھ کٹوا دوں گا:

بس کہ ایک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا
جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

''پردہ نشیں'' اور چھپانے میں اس رعایت کی طرف بھی ذہن جاتا ہے کہ کچھ آزار ایسے ہوتے ہیں جو چھپائے جاتے ہیں۔ تو بھی پردہ نشیں ایک ایسا آزار ہے، جسے چھپایا جاتا ہے۔ دل ایک پردہ نشیں کا بیمار ہے، اس لیے اس کو چھپاتا ہے۔ دل بیمار پردہ نشیں پر اتنا زیادہ لگ گیا ہے کہ وہ ایسا آزار بن گیا جسے چھپایا جاتا ہے۔

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیوں کر
آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اک بار لگا

اس جذبۂ دل کو سینے سے کیوں نہ لگاؤں کہ اسی کی وجہ سے وہ دوڑ کے مرے گلے آ لگا۔

شوخ تھا رنگ حنا میرے لہو سے سو ہے
قتل اغیار سے کیا ہاتھ ترے یار لگا

تری منہدی کا رنگ شوخ اس لہو کا پھل ہے، جو میرے قتل کی وجہ سے تیرے ہاتھوں پر ہے۔ غیر کے قتل سے تجھے کیا فائدہ ہوا کیونکہ رنگ حنا میرے قتل سے شوخ ہی ہو چکا تھا۔ اغیار کا قتل کرنا بھی پسند نہیں ہے۔

تو کسی کا بھی خریدار نہیں پر ظالم
سرفروشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا

ظالم تو خریدار تو کسی کا بھی نہیں ہے۔ تو کسی کو بھی نہیں چاہتا، یہ سب جانتے ہوئے بھی ترے کوچہ میں سرفرشوں کا بازار لگا رہتا ہے۔

دُر و یاقوت کی پھر غیر سے فرمائش ہے
جوہری کی تو دکاں چشم گہر بار لگا

غیر سے پھر دُر و یاقوت کی فرمائش کی جا رہی ہے، اے چشم گہر بار تو جو جوہری کی دکاں لگالے۔ دُر و یاقوت کی مناسبت سے چشم گہر بار کہا ہے۔

یاد آئی مجھے ناصح کی زباں کی تیزی
دیکھ اغوائے رقیباں سے نہ تلوار لگا

رقیبوں کی اِدھر اُدھر کی باتوں پہ نہ جا۔ ناصح کی زبان میں بھی تلوار کی سی تیزی ہے۔

منہ میں کیسا خم صہبا کے بھرآیا پانی
ترے لب سے جو لب ساغر سرشار لگا

ساغر کے ہونٹ کو لگا دیکھ کر تیرے ہونٹوں سے میں بھی پانی بھرآیا۔ شراب کی صراحی کے منہ۔

ناگہاں نعش پہ عاشق کی دم نوحہ گری
کوئی مذکور ترا کرنے ستمگار لگا

عاشق کی نعش پہ جب نوحہ گری جاری تھی تو کسی ستمگر نے تیرا ذکر چھیڑ دیا۔ ذکر کرنے والا ستمگر اس لیے کہ تیرے ذکر سے نعش پر کیا بیتی ہوگی یا پھر ستمگر اس لیے کہ عاشق کے مرنے کو نوحہ گری کرنے والے تجھ سے جوڑیں گے تو تو قاتل کہلائے گا۔ جو میں نہیں چاہتا۔

دیکھ تو حسرت دیدار پسِ مردن بھی
آنکھیں وہ کھول کے تکنے درو دیوار لگا

مردے کی کھلی آنکھوں کی وجہ دیدار کی حسرت ہے، یعنی جو دیدار مرنے سے پہلے نصیب نہ ہوسکا، اسی کے انتظار میں مرنے کے بعد بھی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

اس مقطع میں جو مومن تخلص اور عام مومن، دونوں معنوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ اس شعر میں لفظ ''پھر'' نے اور جان ڈال دی، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ مومن بت خانے میں پہلے بھی آچکا ہے۔ کوشش تو بہت کی کہ کعبہ میں جی لگ جائے، مگر کسی طرح نہ لگا۔

شب غم فرقت میں ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا

سینے میں دم رکنا، جی کا گھبرانا گرچہ یہ تکلیفیں ہیں، لیکن شب غم تیری فرقت کی وجہ سے تھا، اس لیے ان کو بھی مزے کہا ہے۔

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

معشوق کی طرف سے پیغام آنے پر عاشق کا یقین نہ کرنا اس لیے بھی ہے کہ تاعمر اس کو پیغام بھیجتے رہے، مگر جواب نہ آیا، اب آیا ہے تو یا تو وہ دھوکہ دے رہا ہے، یا نامہ بر نے اس کو (یا مجھے) بہکایا ہے ورنہ یاں تک کوئی کیوں اور کیسے آئے گا۔

بل بے عیاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن
وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

آفریں کہ وہ عدو کے آگے وصل کا وعدہ کر رہا ہے اور شرما رہا ہے، یعنی کر رہا ہے۔

سن کے میری مرگ بولے مرگیا اچھا ہوا
کیا بُرا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

جب سامنے آتا تھا تو کتنا برا لگتا تھا، اچھا ہوا مر گیا۔

یار و دشمن راہ میں کل دیکھنا کیوں کر ملے
وہ اُدھر کو جائے تھا اور یہ اِدھر کو آئے تھا

زبان کا شعر ہے۔ راستے میں کل دو دشمن کیسے ملے۔ وہ (محبوب) ادھر کو جا رہا تھا اور یہ (رقیب) ادھر کو آ رہا تھا۔ کیسا عجب اتفاق۔

بات شب کو اس سے منع بے قراری پھر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ، وہ اور کچھ سمجھائے تھا

میری بے قراری کو منع کرنے پر بات اتنی بڑھی کہ وہ اور کچھ سمجھ رہا تھا اور میں کچھ اور سمجھا رہا تھا۔ یعنی دونوں ایک دوسرے کو نہیں سمجھ رہے تھے۔

کوئی دن تو اس پہ کیا تصویر کا عالم رہا
ہر کوئی حیرت کا پتلا دیکھ کر بن جائے تھا

ایک زمانہ تک وہ ایسا خوبصورت (بعد شباب) تھا کہ ہر کوئی اسے دیکھ کر حیرت کا پتلا بن جاتا تھا۔

کوئے صحرا لے چلے اس کو سے میری نعش ہائے
تھا یہی ڈر ان دنوں تلوا مرا کھجلائے تھا

تلوے میں کھجلی ہو جانے سے مراد صحرا کو جانے کی نشانی ہے۔ میرا تلوا کھجلا رہا تھا مجھے معلوم تھا کہ مجھے کوئے صحرا لے جایا جائے گا۔ صنعت تعلیل ہے یعنی وجہ کچھ اور ہے اور بتا کچھ اور رہے ہیں۔

ناز و شوخی دیکھنا وقت تظلّم دمبدم
مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور جھنجھلائے تھا

ظلم کرتے وقت شوخی و ناز تو دیکھو کہ عذر جفا بھی کر رہا ہے اور جھنجھلا بھی رہا ہے۔

ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومنِ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

مومن کو ابھی دیکھا کہ کیا حالت ہوگئی ہے۔ اس طرف (صحرا کی طرف) جا رہا تھا۔

ہماری جان شب تجھ بن دل ناکام لیتا تھا
خدنگ آہ سے تیر قضا کا کام لیتا تھا

رات دل ناکام تیرے بغیر میری جان لیتا تھا اور تیرے فراق میں جو آہ بھرتا تھا، اس سے قضا کا کام لیتا تھا۔ آہ لینا ایسا تھا جیسے تیر کے اگلے حصے سے قضا کا کام لیتا ہے۔

یہی حالت رہی آٹھوں پہر تجھ بن کہ دم الٹے
سحر تک شام سے دل صبح سے تا شام لیتا تھا

تیری جدائی میں آٹھوں پہر میرا دم الٹا جاتا تھا یعنی الٹے سانس آرہے تھے، گویا چین نہیں تھا۔

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر
یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

دشمن بناوجہ کلیجہ تھام رہا ہے، اسے مجھ سے الفت کبھی تھی ہی نہیں۔

چھٹایا کیوں مرا واں رات دن رہنا بہم پھرنا
بتا تو کیا ترا میں گردشِ ایام لیتا تھا

گردش ایام تیرا کیا لیتا تھا، اگر میں واں دن رات رہتا تھا اور بہم پھرتا تھا۔

نہ کانٹوں پر کوئی یوں لوٹے جوں میں بستر گل پر
ترے بن کروٹیں شب اے سمن اندام لیتا تھا

اے پھول جیسے جس طرح میں بستر گل پر قرار تھا، کوئی کانٹوں پر بھی یوں نہ لوٹے۔

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی
کہ ہیرا عاشق خطِ زمرد فام لیتا تھا

خط زمرد فام عاشق ہیرا لے کر مرجانا چاہتا تھا، اس لیے جواہر کی فرمائش رقیبوں سے کی، عاشق سے نہیں کی۔

سحر سے شام تک تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے
نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا

صبح وشام دل نے یہ کیفیت رکھی کہ نہ خود چین سے رہا، نہ مجھے چین سے رہنے دیا۔

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

ناصح کی نصیحت میں مانوں گا نہیں، لیکن اس لیے نصیحت سن لی ہے کہ وہ ہر ہر بات میں تمھارا نام لیتا تھا۔ تمھارا نام کوئی لے اور میں اس کی نہ سنوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھلے ہی وہ ناصح کیوں نہ ہو۔

یہ مومن کے خاص رنگ کا شعر ہے۔ مکمل تغزل کا شعر۔ کس قدر سادگی سے کتنی پُر اثر بات کہی ہے۔

میں اس کی بزم مے میں زہر پی کیوں کر نہ مرجاتا
کہ میرے سامنے اس لب کے بوسے جام لیتا تھا

جام اس کے ہونٹوں سے لگا تھا یعنی بوسے لے رہا تھا، اس لیے اس بزم میں اگر زہر پی کر نہ مرجاتا تو کیا کرتا۔

اگر مومن ہی ہو مومن ولے میں تو نہ مانوں گا
جو عہد دوستی وہ دشمن اسلام لیتا تھا

اگر وہ دشمن اسلام محبوب مومن سے عہد دوستی لیتا تھا تو مجھے مومن کے ایمان میں بھی شک ہے۔

وقت جوش بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا
حلقہ گرداب رشک شعلۂ جوالہ تھا

میرے گریہ کا دریا جوش میں تھا اور میں اس وقت گرم گرم نالے بھی کر رہا تھا، تو دریائے اشک میں جو گرداب تھا، وہ نالہ آتشیں کے سبب گھومنے والا شعلہ، شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا۔ اس مضمون کا غالب کا بھی ایک مشہور شعر ہے۔

شب کہ برق سوز دل سے زہرہ برآب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اخگرِ خورشید تف ہر ژالہ تھا

سورج کی سی گرمی رکھنے والا ہر ژالہ تھا، اس لیے کہ تیرے بغیر بارش نے برہا کی ایسی آگ لگائی۔

اس لب نازک کو برگ گل سے دینی ہے مثال
ہونٹ برگ لالہ تھے اور نیل داغ لالہ تھا

اک نگاہِ سرسری دیوانہ ہم کو کرگئی
گردشِ چشم پری رو ساحر بنگالہ تھا

اس کی آنکھ کے ہلکے سے اشارہ نے بھی ہم کو دیوانہ بنا دیا کیونکہ اس پری رو کی گردش چشم بنگال کے جادو جیسا اثر رکھتی تھی۔ سحر اور ساحر کی رعایت پری رو نے شعر کو اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے۔

دیکھ کر یہ مجمع اُمڈا کیا ہے ابر اشک آہ
حلقۂ اغیار اس کے گردمہ کا ہالہ تھا

حلقہ اغیار کو دیکھ ابر اشک آہ ایسا اُمڈا کہ اغیار کے درمیان چاند سا لگ رہا تھا۔

آبلے کیوں کر نہ نکلیں جائے اشک آنکھوں سے آہ
میرے پہلو میں ابھی وہ آگ کا پرکالہ تھا

وہ آگ کا پرکالہ اس وقت میرے پہلو میں تھا اس لیے میری آنکھوں میں آبلے پڑ گئے ہیں اس لیے آنکھوں سے اشک کی جگہ آگ کے ٹکڑے نکل رہے ہیں۔

شور الفت نے کیا کیا بے مزہ جلاّد کو
گرم خونی سے لب شمشیر پر بتخالہ تھا

الفت کے شور نے جلاّد کو کیا کیا بے مزہ کیا ہے۔ اس لیے کہ خون کی گرمی سے لب شمشیر پر چھالے پڑ گئے۔

آہ پُر دود اپنی کب زیب فلک تھی رات کو
دیدۂ مہتاب میں سرمہ کا یہ دنبالہ تھا

چاند کی آنکھ میں ڈورہ تھا، وہ میری آہ پر دود تھی۔

مومن عاشق طبیعت نوجواں ہی مرگیا
عشق طفل چند سالہٗ دشمن صد سالہ تھا

عشق طفل چند سالہ دشمن صد سالہ ہے۔

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

وہ ستم ایجاد (معشوق) میرے پاس تو کیوں ہونے لگا، رات وہ رقیب کے ہاں بھی نہیں تھا، اس لیے کہ رقیب (عدو) تو خود میرے کوچے کے چکر اس غلط فہمی میں لگا تا رہا تھا کہ وہ میرے پاس ہوگا۔ وہ نہ میرے ساتھ تھا نہ عدو کے، تو پھر کسی تیسرے کے پاس ہوگا، یعنی کوئی نیا عاشق بنالیا ہوگا۔

اس روانی سے ذرا خنجر بیداد رہا
بارے اک دم اثر نالۂ فریاد رہا

نالہ وفریاد کی وجہ سے خنجر کی روانی میں کمی آگئی، جس روانی سے رواں تھا، نالہ فریاد کے اثر سے اس کی تیزی (دھار یا رفتار) میں کمی آگئی۔

بے کسی نے نہ دیا ہائے تہہ خاک بھی چین
تا قیامت الم گریۂ جلاد رہا

مقتول اتنا بے کس تھا کہ قتل کے بعد جلاد پر بھی الم طاری رہا اور الم کی وجہ ہی گریۂ جلاد ہے اور معشوق کی بے کسی ہی گریہ جلاد کی وجہ ہے، اس لیے تہہ خاک بھی بے کسی نے چین نہیں لینے دیا۔

عجیب مضمون ہے۔ اس کو پڑھ کر آج کے کسی شاعر (غالباً بسمل الہ آبادی) کا شعر یاد آیا

سب کے ہونٹوں پہ تبسم تھا مرے قتل کے بعد
جانے کیا سوچ کے روتا رہا قاتل تنہا

☆

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

یہ شعر اس مفروضہ پر ٹکا ہوا ہے کہ عاشق (مقتول) کی اور دیت میں نقد و جان دینے والے (فرہاد) کی۔ فرہاد جس نے شیریں کے عشق میں جان دیدی مگر یہ دیت قابل قبول نہیں کیونکہ عاشق کے خون کی قیمت نقد جاں سے بھی ادا نہیں ہوتی (گویا عاشق کا قتل اس سے بھی بلند ہے) اس لیے فرہاد کے جان دینے پر بھی عاشق کے خون کی قیمت ادا نہیں ہوئی۔ اور حیف، فرہاد کا خون فرہاد کے ہی سر رہا۔

لذت جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی
کیا اثر منتظر دعوت فریاد رہا

جور میں وہ لذت تھی (کیوں کہ معشوق کی طرف سے تھا) کہ اس بات کا خیال ہی نہ آیا کہ فریاد کریں۔ اگر فریاد کرتے تو فریاد میں اثر ضرور ہوتا۔

یاد سہواً اسے اے غیر، ہے نسیاں عمداً
یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

اسے بھولے سے یاد ہے اور بھول جان بوجھ کر ہے۔ جو کچھ وہ بھول گیا ہے وہی اسے یاد ہے۔

سر پٹکنے سے مرے سنگ در اس کا توڑا
یہی سودا ہے تو گھر کا ہے کو آباد رہا

اس کے در پہ اتنا سر مارا کہ اس کے در کا پتھر ٹوٹ گیا۔ اگر یہی سودا رہا تو گھر کیسے آباد رہے گا۔ سودائی اس کو بھی توڑ ڈالے گا۔

کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں میں آزاد رہا

زمین اس لیے گھوم رہی ہے کہ اس میں میرے دل کی تپش ہے۔ میں ایسا مجنوں ہوں کہ جو زنداں میں بھی آزاد ہے۔

چھوٹنا دام شکستہ سے بھی آسان نہیں
میں گرفتار خم گیسوئے صیاد رہا

دام کے شکستہ ہونے پر بھی نہ چھوٹا اس لیے کہ خم گیسو میں گرفتار رہا۔ گیسوؤں کے پیچ اور دام کی بنائی میں جو نسبت ہے اس سے بھی شعر میں لطافت پیدا ہوگئی ہے اور اشارہ یہ بھی ہے کہ میں اصل اسیر تو دام کا نہیں، خمِ گیسو کا ہوں، تبھی تو دام کے شکستہ ہونے پر بھی رہا نہ ہوا۔

لے چلا جنوں جانبِ صحرا افسوس
جب مرے کوچے میں آکر وہ پری زاد رہا

اس بات کا افسوس ہے کہ جنون صحرا کی طرف لے چلا، حالانکہ وہ پری زاد مرے کوچے میں آکر رہنے لگا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب وہ مرے کوچے میں رہنے لگا ہے تو میں بھی وہیں رہوں، لیکن افسوس جنوں صحرا کی طرف لے چلا ہے اور مجھ پر پری کا سایہ ہوگیا ہے۔ اس لیے جنوں کی وجہ سے صحرا کی طرف چلا ہوں۔

گہ غم حور گہ عشق بتاں اے مومن
میں سدا سوختۂ حسنِ خدا داد رہا

کبھی جنت میں حوروں کے ملنے کی فکر، کبھی عشق بتاں، میں ہمیشہ خدادادِ حسن کی چاہ میں مبتلا رہا۔ اس مقطع میں بھی مومن تخلص کے علاوہ عام معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ عام مومن بھی جنت میں حوروں اور دنیا میں عشق بتاں میں مبتلا رہتا ہے۔

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رُسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

سادہ سی بات کو لفظ ''کیا'' کے الٹ پھیر سے شعر بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے توتمھیں دل جیسی قیمتی چیز دی اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا، یعنی کچھ بھی نہیں کیا۔

کشتۂ نازِ بتاں روزِ ازل سے ہوں مجھے
جان کھونے کے لیے اللہ نے پیدا کیا

میں ازل سے نازِ بتاں کا کشتہ ہوں، مجھے اللہ نے جان کھونے کے لیے پیدا کیا ہے۔

روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں، ہم مرگئے
اب تو خوش ہو بے وفا، تیرا ہی لے کہنا کیا

بے وفا روز کہتا تھا، مرتا کیوں نہیں ہے۔ لے ہم مر گئے، اب تو خوش ہے، بے وفا جو تو نے کہا، وہی میں نے کیا۔

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

شمع کے پگھلنے کو آنسوؤں سے تعبیر کیا ہے اور اس کی لو کو سر سے اٹھتے شعلے سے تعبیر کیا ہے کسی نے شمع سے اس محفل کا ذکر کیا ہے کہ اس کی آنکھوں سے دریا، (آنسو) جاری ہیں اور سر سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ محفل کس کی۔ اس کا اشارہ ایک پہلو سے اس شعر کو متصوفانہ بھی بناتا ہے۔

روئیے کیا بخت خفتہ کو آدھی رات سے
میں یہاں رویا کیا اور وہ وہاں سویا کیا

اپنے سوئے ہوئے نصیب پر کیا رونا (نصیب سے مراد معشوق بھی ہو سکتا ہے۔) میں یہاں روتا ہوں اور وہ وہاں روتا ہے۔

آتش الفت بجھادی داغہائے اشک نے
مدعی کی گرمی صحبت نے جی ٹھنڈا کیا

مدعی کی صحبت کے بعد اشک بہانے کے علاوہ کیا چارہ تھا۔ رونے سے دل ٹھنڈا ہو گیا۔

آنکھ عاشق کی کوئی پھرتی ہے اے وعدہ خلاف
دیکھ لے میں مرتے مرتے سوئے در دیکھا کیا

عاشق کی آنکھ نہیں پھرتی، یعنی عاشق وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔ دیکھ لے مرتے مرتے بھی تیرے در کی طرف ہی آنکھیں ہیں۔

دلبروں میں بے وفا میری وفا کی دھوم ہے
بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا

تو نے غیروں سے راز افشا کیا اس لیے دلبروں میں میری وفا کی دھوم ہے۔

چارہ گر کعبے میں اس کے آستاں سے لے گئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

یہ مومن کے خاص مزاج کا شعر ہے۔ اس کے آستاں سے زبردستی مجھے کعبے لے گئے، جب کہ میری چارہ گری تو اسی آستاں سے تھی۔

غیر کا اور آپ کا گر دل نہیں ہے ایک تو
کیوں ترے دل میں مرے، یاد نے آنے کا چرچا کیا

جب غیر کا اور آپ کا دل ایک ہے، تو پھر میرے دل میں تیری یاد کیوں آئے۔

کیا خلش تھی رات دل میں آرزوئے قتل کی
ناخنِ شمشیر سے میں سینہ کھجلایا کیا

میری قتل کی آرزو، یعنی اس بات کی تمنا کہ معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جائے، اس قدر شدید تھا کہ رات تلوار کی نوک سے میں نے سینہ کھجلایا۔

کیا خجل ہوں اب علاجِ بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دھڑکا کیا

بہت خوب غزل کا شعر ہے۔ بے قراری کے علاج کے لیے اس سے کہا تھا کہ دل پر ہاتھ رکھ دے۔ مگر اب شرمندہ ہوں کہ اس کے دل پر ہاتھ رکھنے کے باوجود دل دھڑک رہا ہے۔ شرمندگی اس لیے کہ اسے تو مارے خوشی کے دھڑکن بھول جانا چاہیے تھا۔

عرضِ ایماں سے ضد اس غارت گرِ دیں کو بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

اس سے ایمان کی بات کیوں کی، اس کی ضد اور بڑھ گئی، مومن اس غارت گرِ دین سے کیوں کہا۔

کسی کا ہُوا آج، کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

تو کبھی کسی کا ہوا ہی نہیں۔ تو کسی ایک کا ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا اس نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

ایک ہی نظر سے سارے جہاں کا قتل کر دیا، سب قتل ایک ساتھ ہوئے تو کسی نے کسی کے

قتل ہونے کا تماشا نہیں دیکھا۔

نہ میری سنے وہ نہ میں ناصحوں کی
نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا

میری بات وہ (معشوق) نہیں سنتا اور میں ناصحوں کی نہیں سنتا، یعنی کوئی کسی کی نہیں سنتا۔

مجھے مار ڈالا ہے انکار نے پھر
یہ کہنا کہ کیا مجھ پہ دعویٰ کسی کا

میں تیرے انکار کی وجہ سے مرا ہوں، اب دعویٰ نہ کرتا۔

جو بھر جائے اس بے وفا سے تو جانوں
کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

دل پر کسی کا زور نہیں۔ پس اس کو جب یقین ہوگا جب میرے دل پہ اس کا زور نہ چلے۔

صبا نکہت یار لائی کہاں سے
نہیں دخل اس کوچہ میں اصلاً کسی کا

اس کے کوچے میں دخل نہیں، صبا یہ نکہت کہاں سے لائی ہے۔

وہ کرتے ہیں بے باک عاشق کشی یوں
نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

عاشق کو وہ یوں کھلے عام مارتے ہیں، جیسے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہ ہو۔ یعنی جس کا جو دل چاہے کرے، کوئی روکنے والا نہ ہو۔

کوئی کیا کرے آپ ہرجائی ہو تم
نہیں میری جاں شکوہ بیجا کسی کا

تم خود ہی ہرجائی ہو، باقی سے شکوہ کیا۔

دم الحذر اور عشق بتاں سے
تجھے ڈر ہے اسے مومن ایسا کسی کا

عشق بتاں سے تجھے حذر (ڈر) نہیں، تو کس سے ڈرتا ہے۔

☆☆☆

ریاض قدوائی

مومن کی غزل کعبۂ معنی

کعبۂ معنی بنا مومن کا ہر بیت الغزل   مومن کی غزل کے بارے میں اپنے زمانہ کے مشہور تذکرہ نگار ناطق لکھنوی نے یہ کہا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن بن حکیم غلام علی خاں کی پیدائش 1800ء میں اور وفات 1855ء میں ہوئی۔ ان کے اشعار میں اتنی تاثیر اور گہرائی تھی کہ غالب کو بھی رشک ہوتا تھا جس کا انھوں نے اظہار کیا۔ ان کی کچھ غزلوں کے مفہوم پر یہاں طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

ردیف الحاء

گر چندے اور یہ ہی رہی یار کی طرح
ہم بھی بنیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

اگر چند روز اور دوست یعنی محبوب کا یہ انداز رہا تو غیروں کی طرح ہم بھی بس ہوس کے بندے بن جائیں گے۔

آواز گنبد اس سے شکایت عدو کی تھی
ناچار چپ ہیں صورت دیوار کی طرح

محبوب سے غیروں کی شکایت کا جواب نہ ملا، سوائے اپنی ہی صدائے بازگشت کے۔ مجبوراً ہم چپ ہیں، جیسے دیوار بے حس وحرکت ہوتی ہے۔

سونے دیا نہ اس نے شب وصل میں بھی کیا
ہم جاگتے ہیں طالع بیدار کی طرح

محبوب کی جدائی میں اور اس کے انتظار میں تو شاعر کی راتیں جاگتے کٹتی ہی تھیں، جب

ملنے کی باری آئی، تو وہ بھی کیا ستاروں کی طرح اس کی بھی بیداری ہے؟

پھرتا ہے بہر کشتن عشاق کو، بہ کو
گردش میں ہے وہ چرخ ستمگار کی طرح

معشوق اس طرح اپنے چاہنے والوں کا (نگاہوں سے) گلی گلی قتل کرتا پھرتا ہے جیسے آسمان کے ستارے اپنی گردش سے ستم ڈھاتے ہیں۔

ہوتے ہیں پائمال گل اے باد نوبہارو
کس سے اڑائی تو نے رفتار کی طرح

محبوب کو نئی آنے والی بہار کہا ہے جس سے اصل پھولوں کو رشک ہوتا ہے، جیسے وہ روندے جارہے ہوں۔

چین جبیں بلا و نگاہِ غضب ستم
کرتی ہے قتل اس بت خونخوار کی طرح

جیسے وہ قاتل یعنی محبوب خود جان لیتا ہے، وہ کام اس کے ماتھے کے بل اور غضبناک (قہر کی) نگاہ کا بھی ہے۔

خو رنج رشک غیر کی بھی ہم کو ہوگئی
اب اور کچھ نکالیے آزار کی طرح

غیر یعنی رقیب کی رقابت کی کوفت کی تو عادت ہوگئی ہے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اب دکھ پہنچانے کا کوئی اور طریقہ نکالے۔

ہوتے ہیں قتل غیر ادھر ہے نگاہِ لطف
ارماں مرے نکلتے ہیں تلوار کی طرح

غیروں پر نگاہ مہربانی کی ہے مگر میرے ارمان تو میرے لیے تلوار بن جاتے ہیں۔

کرتا ہے ابر اپنا لہو پانی ایک کیوں
کب رو سکے گا دیدۂ خونبار کی طرح

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح اس کا خون آنسو بن کر بہہ رہا ہے اس کے آگے بادل کا پانی بہانا بیکار ہے۔ خون پسینہ ایک کرنا، دن رات ایک کرنا یہاں قابل غور ہے بادل کا اپنا لہو پانی ایک کرنا۔

بس ناز کی ضعف کہ گلگشت باغ میں
چبھتے ہیں میرے پاؤں میں گل خار کی طرح

بقول شاعر عاشق اتنا زیادہ کمزور عشق میں ہوگیا ہے کہ باغ میں پھول بھی پیروں کو کانٹے معلوم ہوتے ہیں۔

دل میں ہوائے بت کدہ ظاہر میں کیا حصول
رہنا حرم میں مومن مکار کی طرح

مفہوم یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکار کہہ کر ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بت پرستی کی روایات کے اثر میں ہیں، پھر رسم ادا کرنے سے کیا حاصل۔ مقطع کو چھوڑ کر اس غزل کے زیادہ تر، غالباً تقریباً سبھی اشعار کے پس منظر میں ان کے زمانے کے ارباب اقتدار کے ظلم وستم ہیں۔

نوٹ: طالب علموں کو اگر علم نہ ہوتو جان لیں مومن نے کئی جگہ لفظ طرح ''مثل'' کے نہیں، بلکہ انداز یا طریقہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

معشوق سے کہہ رہے ہیں کہ اگر اس کا دل بھی آئندہ کہیں لگ گیا، تو شاعر کی طرح کئی پہر روتے ہی گزرے گی۔

آتا نہیں ہے وہ تو کسی ڈھب سے داؤ میں
ملتی نہیں ہے ملنے کی اس کے کوئی طرح

پھر محبوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس پر کوئی طریقہ اثر نہیں کرتا اور ملنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

تشبیہ کس سے دوں کہ طرحدار کی مرے
سب سے نرالی وضع ہے سب سے نئی طرح

شاعر کے طرحدار محبوب کے ایسے نرالے انداز وادائیں ہیں جن کی کسی انسان یا چیز سے مثال ہی نہیں دی جاسکتی۔

مرچک کہیں کہ تو غم ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

مومن کی غزلوں میں عاشق ومعشوق کے تمام باہمی انداز ومکالموں کی تصویر کشی ہے۔ عاشق کو کوسا جاتا ہے کہ مرجائے تو اس کا جواب ہے کہ یہ تو میرے لیے اچھا ہے مگر کہنے کا انداز برا ہے۔

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

سچے عاشق کا بیان ہے، اس کو کسی طرح چین نہیں ملتا، دور رہنے سے بھی نہیں اور ملنے سے بھی نہیں۔

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

اس شعر میں ایک پچھلے شعر کی نسبت برعکس بات ہے۔کوئی جس کو چاہتا ہے اس کی زبان سے گالیاں بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔دل چاہتا ہے کہ وہ دہراتا رہے۔

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

اگر صرف آسمان یعنی مقدر ظلم ڈھاتا تو ہم ایسے تباہ نہ ہوتے لیکن ہر طرح سے دوسری مصیبتوں نے بھی گھیرا۔

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

شاعر مخمصے میں ہے، نہ تو محبوب کے گھر جاتے بنتا ہے نہ بغیر جائے چین ہے، ہر طرح مشکل ہے۔

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں
کرتا ہے کون ظلم کسی پر کسی طرح

شاعر کا معشوق ظلم وجور میں عدیم المثال ہے، ورنہ اور بھی محبوب ہیں جو اتنی قیامت نہیں

ڈھاتے۔

ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

سوال کرتے ہیں کہ جس طرح ظالم حسینوں کے ہاتھوں ہم قریب المرگ ہیں، کیا دوسروں کا بھی یہی حال ہوتا ہے، یعنی زندگی اجیرن رہتی ہے؟

ردیف الخاء

عدو نے دیکھے کہاں اشک چشم بریاں سرخ
نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سرخ

ہماری جلتی ہوئی آنکھوں کے خون کے آنسو جن سے آستین، رومال اور دامن تک رنگا ہے، یہ سب غیر رقیب کیا جانے؟

نمود حسن خطِ یار سے نہ ہو کیونکر
بہار ہے جو تہ سبز ہو نمایاں سرخ

ہلکا ہلکا خط بڑھنے کو سبزہ بھی کہتے ہیں جس کے نیچے جلد کی آب وتاب (بہار) سرخ رنگ کو نمایاں کررہی ہے، اس طرح معشوق کے بال حسن کو ابھارتے ہیں۔

تمھارے وشنہ کا دست جفا نے کام کیا
ہے زرد رنگ گلو حلقۂ گریباں سرخ

زبس فگار ہوئے پاؤں خار و خارا سے
تمام دشت سے جوں وسعت گلستاں سرخ

جس طرح باغ پھولوں سے سرخ ہوتا ہے، ایسے ہی کانٹوں اور پتھروں سے میرے زخمی پاؤوں نے ویرانے کو رنگین بنادیا (سنگ خارا)

مَلی ہیں غیر نے پائے نگار سے آنکھیں
سرشک خوں سے نہیں پنجہ ہائے مژگاں سرخ

یقیناً رقیب نے محبوب کے پیروں پر آنکھیں رگڑی ہیں، ورنہ ان میں خون کی سرخی تو آ نہیں سکتی کیونکہ وہ خون کے آنسو روتا ہی نہیں، سرخی محبوب کے پیروں کی ہے۔

گماں قہر سے اپنا تو رنگ زرد ہے اور
سیاہ مستی مے سے ہے چشم جاناں سرخ

ہوا ہوں عشق میں گل پیرہن کہ لازم ہے
مرا کفن بھی ہو جوں جامۂ شہیداں سرخ

چونکہ مجھے پھولوں کا لباس پہننے والے معشوق سے عشق ہے، لہٰذا لازمی ہے کہ مجھے ایسا کفن پہنایا جائے جو شہیدوں کے لباس کی طرح سرخ ہو۔

سرائتیں ہیں یہ طوفان اشک خونی کی
کہ ایک ایک شجر ہے برنگ مرجاں سرخ

میرے خون کے آنسو جو طوفان لائے ہیں اسی کے اثر سے ہر ایک پیڑ پودا مرجان کی طرح لال ہو گیا ہے۔

کرم جو غیر پہ دیکھا لہو اتر آیا
نا پوچھ کیوں تیری آنکھیں ہیں بن کے ناداں سرخ

غیر پر عنایت دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا، حالانکہ آنکھیں بظاہر انجان بن گئیں، اس لیے یہ سرخ ہو گئیں۔

نوید مرگ انھیں جو ہیں زخمی لب یار
کہ رنگ پاں سے ہوئے اور لعل خنداں سرخ

محبوب کے ہنستے ہوئے لال ہونٹوں پر پان کی اضافی لالی چڑھ جاتے دیکھ کر لوگوں پر گویا تلوار چل گئی۔ اب تو ان کی موت ہی اس تڑپ کو ختم کر سکتی ہے۔

نظارۂ رخ مردم سے کیوں نہ غم ہو کہ تھا
ہمارا رنگ بھی پیش ورود ہجراں سرخ

ہم کو کیوں نہ خوش و خرم لوگوں کو دیکھ کر کوفت ہو، کیوں کہ ہجر کے عذاب سے پہلے ہمارا بھی

رنگ سرخ تھا۔

ہمارے خون کا دھبّہ نہ جائے حشر تلک
وہ لاکھ بدلے قبا پر رہے گا داماں سرخ

ظالم کے ظلم کے نشانات مٹ نہیں سکتے، چاہے وہ جتنی ترکیبیں کرے، دامن پر تا قیامت دھبہ رہے گا۔

غریق گریۂ خونی رہا نہ کر مومن
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

خون کے آنسو رونے سے لباس تک سرخ ہو جاتا ہے، جب کہ مسلمان سرخ لباس نہیں پہنتے۔لہٰذا یہ نہیں کرنا چاہیے۔

ردیف الدال

ہم دام محبت سے ادھر چھوٹے اُدھر بند
پرواز بھی کی آہ تو جوں طائر پر بند

جو عاشق ہیں وہ محبت کے جنجال سے بس دم بھر کو چھوٹتے ہیں اور آزادی بھی ملی تو ایسی کہ جیسے پرندے کے پر باندھ دیے گئے ہوں۔

دیکھا نہ کسی کی طرف ایمائے حیا سے
جادو کو کیا نرگس جادو نے نظر بند

مومن کے دور سے اب تک اس شعر کی ستائش میں سب نے الفاظ کے نہ معلوم کتنے دریا بہائے ہوں گے۔اگر کسی جادو کے ذریعہ کسی کی آنکھ نرگس کا پھول بن جائے تو ہر نگاہ اس پر پڑے گی، جس سے لامحالہ شرم آئے گی، اس حیا نے آنکھوں کو تالا لگا دیا۔نظر بندی بھی ایک طرح جادو ہے۔لہٰذا ''نظر بند'' ذو معنی ہے۔

یہ مشت پر سوختہ پھونکیں گے قفس کو
تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

قید پرندے کی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے مٹھی بھر پر حرارت سے جل رہے ہیں،

اس کو کسی اور کے ساتھ صیاد بند نہ کرے، ورنہ پنجرے یا قید خانے میں آگ لگ جائے گی۔ دوسرا بھی جل جائے گا۔

وہ آخر شب آئے ہیں کچھ بات تو کرلوں
کر اپنی زباں دم کے دم اے مرغ سحر بند

عاشق کہتا ہے کہ معشوق ایسے وقت آیا جب رات ختم ہونے لگی۔ وہ مرغ سے کہہ رہا ہے کہ اپنی بانگ ذرا دیر ملتوی کردے تاکہ دو باتیں کرلوں۔

کیا ٹھہرے دل بوالہوساں میں تری الفت
شیشہ میں پری کرتے ہیں اربابِ ہنر بند

اہل ہوس تیری الفت کو کیا سمجھیں گے؟ اس دنیا میں تو لامکاں لال پری کو شیشے میں بند کردیا جاتا ہے۔

شاید کہیں تو نے بھی اسے خواب میں دیکھا
آنکھیں تری اے بخت ہیں کیوں آٹھ پہر بند

شاعر اپنے سوئے مقدر یعنی ستارے سے کہہ رہا ہے کہ اس نے بھی میری طرح خواب میں محبوب کو تو نہیں دیکھ لیا، آخر کیوں ہر وقت اس کی آنکھیں بند رہتی ہیں۔

اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے
کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

اس شعر میں لفظ ''مگر'' شاید کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کچھ نہیں کہوں گا۔

کیا حضرت مومن کہیں کعبے کو سدھارے
سنسان ہے گھر کس لیے کیوں آج ہے در بند

آج مومن کے گھر میں سناٹا ہے اور دروازہ بھی بند ہے، کیا وہ کعبہ کو چلے گئے۔ ''مومن اور کعبہ'' میں لطیف رعایت لفظی ہے۔

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد
جیسے قفس میں مرغ چمن کو چمن کی یاد

جس طرح قید میں پرندے کو اپنے باغ کی یاد ستاتی ہے، اسی طرح ہم کو وطن کی یاد پریشان کرتی ہے۔

گلگوں قبا پہن کے کیا قتل غیر کو
کیا آئی اپنے کشتۂ خونی کفن کی یاد

معشوق جس نے سرخ لباس پہن کر غیر کا دل لوٹ لیا، یعنی جان لے لی، اس سے پوچھ رہے ہیں کہ ایسا کیوں کیا؟ کیا تمھیں اس واقعی جان دینے والے کی یاد آگئی، جس کا لباس خون سے رنگین تھا۔

از خویش رفتگی ہے عناں کش زباں زباں
دکھلائے گی عدم ہی کہیں اس دہن کی یاد

محبوب کے منہ (دہن) کی یاد اس طرح میرے ساتھ ساتھ پیچھے پڑ گئی ہے کہ موت ہی سے ہم کنار کرے گی۔

تو آب زن نہ ہوئے تو کیا جانے کیا کرے
دشمن کے دل سے میرے دم شعلہ زن کی یاد

میری جلتی آہیں دشمن کے دل کو جلائے دے رہی ہیں۔ وہ پانی کا سہارا نہ لے تو کیا کرے؟

اے محتسب تو نہ توڑ یوں شیشہ کو دیکھنا
آتی ہے مجھ کو سنگ دل، دل شکن کی یاد

نصیحت کرنے اور عمل کا حساب لینے والے سے کہہ رہے ہیں کہ دیکھ شیشہ مے نہ توڑنا کیونکہ اس کا غم نہیں بلکہ مجھے یاد آجاتا ہے کہ کیسے ایک سنگ دل نے میرے شیشۂ دل کو توڑا۔

تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں
کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہ کن کی یاد

مجھ سے کہتے ہیں کہ کیا تمھیں فرہاد کی روداد یاد ہے تا کہ میں غیر کی شکایت زبان پر نہ

لاؤں۔

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل
پھر مجھ کو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

جب بھی مجھ کوکسی پھولوں جیسے لباس والے کی یاد آتی ہے، میں اپنے کپڑے اس قدر پھاڑ ڈالتا ہوں جیسے پھول چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

ایسے ہی روز گر ستم نو بہ نو رہے
تم کو بھلا رہے گی سپر کہن کی یاد

اگر تم ایسے ہی روز نئے نئے ستم کرتے رہے تو تمھیں میری پرانی ڈھال کی یاد کہاں رہے گی۔

ہے کفر وبدعت ایک نہیں تار سبحہ سے
زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

ردیف الذال

نامہ رُونے میں جو لکھا تو بہے گا کاغذ
کہ بنا ہم گہر صفحۂ دریا کاغذ

شاعر کہتا ہے کہ اگر رو رو کر خط لکھا تو کاغذ بہنے لگے گا اور بہتا ہوا دریا کی سطح پر اس کے موتیوں کے ساتھ ساتھ چلے گا۔

اس کے کوچے سے چلا آئے ہے اڑتا کاغذ
پھاڑ کر پھینک دیا کیا مرے خط کا کاغذ

محبوب کے کوچے سے کاغذ اڑتا ہوا آتا دیکھ کر شاعر کہتا ہے کہ یہ کیوں؟ کیا اس نے میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا جو اُڑ رہا ہے۔

کیا جواب آئے کہ کثرت سے خطوں کے میرے
کیمیایاب سیاہی بنی عنقا کاغذ

میں نے (معشوق کو) اتنے زیادہ خط لکھے کہ اب روشنائی اور کاغذ نایاب ہو گئے۔ تو پھر

خطوں کا جواب کیسے لکھا جائے اور کیسے آئے۔

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا
جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

طیش میں معشوق سے کہتے ہیں کہ تم کو معلوم ہے کہ میرے پاس تمھاری کیا کیا تحریریں ہیں، وہ سب کی سب رقیبوں کو دکھاؤں گا۔

لکھ کے بدمستی غم تا کہ وہ میکش پڑھ لے
باندھ دیتا ہوں سر شیشۂ صہبا کاغذ

اس لیے کہ شراب پینے والا غم کی بدمستی سے واقف ہو جائے، اس بدمستی کا حال لکھ کر شیشۂ مے کے منہ پر باندھ دیتا ہوں۔

مشق کرتے ہیں وہ کیوں لفظ نظر بازی کی
پردہ دیدۂ مشتاق ہے یہ یا کاغذ

کاغذ پر بار بار لفظ ''نظر بازی'' کی مشق کیوں کی جا رہی ہے، یہ تو اپنی دید کی خواہش کی گویا آڑ ہے۔

رنگ اڑ جانے کا احوال اسے لکھنا ہے
زردی رخ سے افشاں میں کروں گا کاغذ

میں خط کے بجائے کاغذ اپنے چہرے سے لگا کر زرد کر کے بھیجوں گا تا کہ اس کو بتا سکوں کہ میرا رنگ کیسا پیلا ہو گیا ہے۔

وصف لکھوں میں تری آنکھوں کے ڈوروں کا اگر
رنگ گل خامہ دے اور نرگس شہلا کاغذ

اگر مجھے تیری آنکھوں کے ڈوروں کی صفت بیان کرنا ہو جو سونے کے بعد پڑ جاتے ہیں تو گلاب اور اس کا رنگ بطور قلم اور نرگس بطور کاغذ استعمال کرنا چاہیے۔

ہو گیا اس لب لعل دور دنداں کے سبب
نسخہ نسخۂ اکسیر مسی کا کاغذ

جس کاغذ میں مسی آئی تھی اس کو لگانے والے کے لعل جیسے ہونٹوں اور موتی نما دانتوں نے نسخہ اکسیر بنا دیا۔

ضد یہ ہے خط سے مرے تاؤ ہزاروں کھائے
دستِ اغیار میں بھی اگر کبھی دیکھا کاغذ

معشوق کو میرے خط سے اتنی کد ہے کہ اگر رقیبوں کے ہاتھ میں بھی کبھی اس کو دیکھ لیا تو بے تحاشہ مشتعل ہو گیا۔

یاں تلک تو ہوں سیہ کار کوئی پڑھ نہ سکا
حشر میں جب میرے اعمال کا کھولا کاغذ

میرے اعمال کا یہ حال ہے کہ جب حشر کے دن میرا نامہ اعمال کھولا جائے گا تو کوئی اس کو پڑھ نہ سکے گا کیونکہ اس میں کالک ہی کالک پھیلی ہوگی۔

قبر میں چھوٹے عذاب دل بیتاب سے ہم
نام جب لکھ کے ترا سینہ پہ رکھا کاغذ

قبر کا عذاب مشہور ہے، مگر شاعر کو دل کا درد اور دل کا عذاب تھا جب اس نے معشوق کا نام لکھ کر اپنے سینے پر رکھا تو اس عذاب سے نجات ملی۔

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

مومن کہتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں اس قدر قرب ہے کہ غزل سرا کے بجائے مرثیہ پڑھتے معلوم ہوتے ہیں۔ جو سنتا ہے رو دیتا ہے۔

ردیف الرائے

نہ کیونکر بس مواجاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

تیری یاد سے میری جان نکلی جاتی ہے جس طرح تو مسکرا کر منہ ہی منہ میں مجھے کچھ کہتا تھا وہ سب بار بار یاد آتا ہے۔

کہاں لختِ جگر ہیں سیل گریہ میں چڑھا دریا
چلے آتے ہیں یہ ڈوبے ہوؤں کے لاشے بہ بہ کر

میرے آنسوؤں سے ایسا سیلاب آیا کہ اس میں ڈوبنے والے انسانوں تک کی لاشیں بہ کر آ رہی ہیں۔تو ایسے میں میرے کٹے ہوئے کلیجے کے ٹکڑوں کا کہاں پتہ چلے گا۔

بہار باغ دو دن ہے غنیمت جان اے بلبل
ذرا ہنس بول لے ہوزمزمہ پرداز چہ چہ کر

کسی نوخیز سے کہہ رہے ہیں کہ زندگی کی بس کچھ ہی عرصہ کی بہار ہے، جتنا چاہے ہنس بول لے۔پرندے کی طرح نغمے گائے اور باتیں کرے۔

نویداے دل کہ رشک غیر سے چھوٹے اسے ہم نے
ستم کا کردیا خوگر جفا وجور سہ سہ کر

اپنے آپ کو خوشخبری دے رہے ہیں کہ ہم نے مسلسل ظلم وستم برداشت کر کے رقیب کو بھی اس کا عادی بنادیا۔لہٰذا اب اس کی جلن کا شکار نہیں ہونا پڑے گا۔

ستم ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی
رکھے رومال چشم خونفشاں پر لاکھ تہ تہ کر

ظلم وستم سے اس قدر رقت ہوئی کہ بار بار رومال تہہ کر کے آنکھوں پر رکھنے کے باوجود ان سے خون آتا ہی رہا بار بار۔

لگی ہچکی ہے سرزانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا
کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

اس وقت جب موت کی ہچکی آ رہی ہے اور سر کو کسی زانو کا سہارا ہی نہیں،سوائے اپنے غم کے ایسے وقت بھی کسی کی یاد آ رہی ہے کہ وہ کیسے ہر وقت ہنس ہنس کر زانو پر ہاتھ مارتا تھا۔

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبہ کو جا مومن
صنم خانہ میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

مومن اپنی آڑ میں دوسروں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ خدا سے لو لگا کر کعبہ کی راہ لیں۔صنم خانے میں یعنی حسینوں کے بیچ گمراہ رہ کر کیا ملے گا۔

اے تند خو آجا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر
کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

شاعر بدمزاج معشوق سے کہہ رہا ہے کہ ایک بار سیدھے قتل کرنے کے لیے خنجر لے کر آجائے، ہم تو مدت سے مرنے کے لیے تیار ہو کر اپنا کفن سر سے باندھے ہیں۔

یا وہ ڈبوئے گا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے فلک
آئے تو روتے ہیں ہم شرط ابر تر سے باندھ کر

اپنے آنسوؤں کو لامتناہی بارش سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ اگر ایسا بادل آجائے تو ہم اس سے شرط باندھ کر روتے ہیں، یا تو وہ زمین کو غرق کردے گا یا پھر ہم اپنی آہوں سے جوان آنسوؤں کے ساتھ آسمان پر جائیں گی، آسمان کو ڈبو دیں گے۔

خط میں تو لکھ سکتا نہیں احوال سوز دل اسے
پر بھیج دوں جی میں ہے پروانے سے پر باندھ کر

دل جلن کا حال خط میں تو نا قابل بیان ہے مگر سوچتا ہوں پروانے کے پر سے باندھ کر اس کو بھیج دوں۔

دشمن سگ کوچہ نہو اس شوخ آہو چشم کا
نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ سے پر باندھ کر

ہے سرخ پٹکا اور خون غیر میں رنگا ہوا
کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھ کر

شاعر کا محبوب سرخ دوپٹہ جو رقیب کے خون میں رنگا ہے، کمرے سے باندھ کر آیا ہے، اس سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا میرا قتل کرنے کا تہیہ کر کے نکلے ہو۔

آجھا نک تو بھی تو کہیں بے دید کیسی ٹکٹکی
بیٹھے ہوئے ہیں روزن دیوار و در سے باندھ کر

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

عاشق کے کلیجے کے زخم کا جو حال ہوا جراح نے اس کو دیکھ کر پٹی کھولنے کے بعد فوراً دوبارہ

باندھ دی، اس سے سوال کرتے ہیں آخر ایسا کیا دیکھا۔

دیوانہ نازک ہوں میں فصد و مژگان نیشتر
لے فصد میرے ہاتھ کو تار نظر سے باندھ کر

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لیے یہ زور شور
کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

مومن حریفوں کی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ اس کوشش میں کہ مومن سے اچھی غزل ہو جائے، ہم کیا مضامین لے کر آئے۔ اور ان کو کتنے ہنر سے ادا بھی کیا۔ (مگر بیکار)

جاتے تھے صبح رہ گئے بیتاب دیکھ کر
طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھ کر

شاعر کے خوابیدہ ستارے صبح رخصت ہو رہے تھے کہ اس کی بیتابی دیکھ کر چونک پڑے اور ٹھہر گئے۔

پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار
آنکھیں جو چراتے ہیں مجھے احباب دیکھ کر

جب سے دوست دشمن بن گئے اور تیری قربت حاصل کر لی، تب سے یہ احباب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔

یہ تشنہ کامی نگہ گرم دیکھنا
حیرت سے رو دیا طرف آب دیکھ کر

توبہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے
غش ہو گیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر

سرخ شراب کا رنگ ہی دیکھ کر شاعر کے ہوش جاتے رہے، تو پھر دل میں کسی کدورت کا کیا سوال۔

اٹھی نہ نعش بھی ترے کوچہ سے بعد قتل
ہم رہ پڑے زمین کو شاداب دیکھ کر

تمھارے کوچے میں ہمارا قتل ہوا اور لاش اُٹھی بھی نہیں تھی کہ زمین سرسبز ہوگئی، یہ دیکھ کر ہماری روح پر رقت طاری ہوگئی۔

روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہ ہوں
آنکھیں سی کھل گئیں درنایاب دیکھ کر

مجھ کو حیرانی کیوں نہ ہو کہ وہ میرے حال پر رونے لگے، جیسا کہ کبھی نہیں ہوتا تھا (آنکھوں میں) یہ نایاب موتی دیکھ کر میری آنکھیں بے یقینی سے پھٹ گئیں۔

شوق وصال دیکھ کرآیا عدو کے گھر
سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر

چاندنی رات دیکھ کر محبوب سے ملنے کی اتنی بیتابی اور دیوانگی ہوئی کہ کچھ نظر نہ آیا اور عاشق اس کے بجائے رقیب کے گھر پہنچ گیا۔

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ کر
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

مومن اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں کہ یہ کیا کہ جلوہ دیکھنے کا تقاضا کر دیا جو کہ کفر کے مترادف ہے۔ تیرے تاب و برداشت کا یہ حال ہے۔ خود ہی جواب دیتے ہیں کہ دین کے ساتھ جو آداب وابستہ کر دیے گئے ہیں انھوں نے مجبور کر دیا ہے۔

یاد اس کی گرمی صحبت دلاتی ہے بہار
آتش گل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار

جب بہار آئی ہے اور ہر طرف پھولوں کے کھلنے سے آگ جیسا منظر ہے تو میرا سینہ جل رہا ہے کہ معشوق کے قربت کی گرمی یاد آ رہی ہے۔

کوہ وصحرا میں لیے فرحت پھرتی ہے بہار
میں تو کیا ان کو بھی دیوانہ بناتی ہے بہار

پہاڑ ہوں یا صحرا بہار ہر طرف تازگی کی لہر سے میرے ساتھ ساتھ ان سب کو دیوانہ بنا رہی ہے۔

کھل چکی نرگس کہ شرماتی ہی جاتی ہے بہار
دیکھ کر اس کی بہار آنکھیں چراتی ہے بہار

نرگسی آنکھوں والی بہار یعنی محبوب کو دیکھ کر اصل بہار شرماتی اور آنکھیں چراتی جا رہی ہے۔

جلوۂ لالہ رقیبوں کو دکھاتی ہے بہار
داغ کھانے پر مرے کیا داغ کھاتی ہے بہار

آمد آمد ہے چمن میں کس سمن اندام کی
سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

سمن کی طرح ہولے ہولے جو آ رہا ہے، بہار اس کے لیے سبزے کا مخمل بچھا رہی ہے۔

خاک تو مرغ گلستاں کو خزاں ہی نے کیا
دیکھیے اب آن کر کیا خاک اڑاتی ہے بہار

پہلے ہی خزاں نے چمن کے پرندے کو جلا کر خاک کر دیا ہے، دیکھو اب آ کر بہار کیا کرتی ہے سوائے خاک اڑانے کے۔

ہے خزاں میں بھی وہی جوش جنوں کیا ہوگیا
اب کہیں پاس اپنے ہم کو ہی بلاتی ہے بہار

یہ عجیب بات ہے کہ خزاں میں بھی ہمارا جنون ویسا ہی ہے جیسا پہلے بہار میں تھا۔ اب بہار نہ جانے کہاں پہنچ کر وہاں سے ہم کو ہی اپنے پاس بلا رہی ہے اس لیے یہ جوش جنوں ہے۔

جوش گل سے یاد آتی ہیں تری رنگینیاں
رنگ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ہے بہار

موسم بہار میں پھولوں کے کھلنے سے تیری رنگین ادائیں یاد آتی ہیں، اس کی وجہ سے میرے اڑتے ہوئے رنگ کے ساتھ ساتھ بہار کا رنگ چڑھ رہا ہے۔

داغ اور زخم اس میں ہیں جو لالہ و گل اس میں ہیں
فصل ہے یا آپ کے عاشق کی چھاتی ہے بہار

بہار کا منظر کچھ ویسا ہی ہے جیسا تمھارے عاشق کا سینہ، کیوں اس میں جو پھول ہیں، لالہ وگل ہیں وہ سرخی سے بھرے ہیں۔

امتیاز دل دہی و دلبری میں فرق ہے
تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

جس طرح دل کو تسلی دینے اور دل دینے میں فرق ہے ویسے ہی یہ فرق ہے، کہ تم کو خزاں اور ہم کو بہار اچھی لگتی ہے۔

محو حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بلبل تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

میری ضد سے غیر پر تیری عنایت دیکھ کر
سبزۂ بیگانہ کے قربان جاتی ہے بہار

ابتدائے فصل ہی میں غیر بھی کھاتے ہیں گل
دیکھیے اس سال کیا کیا گل کھلاتی ہے بہار

چشم گل پر قدم رکھتا ہوا کو آئے گا
عطر فتنہ میں گل نرگس بساتی ہے بہار

خندۂ دیوانگی یاں بعد مرون بھی رہا
خاک سے اگتے ہیں گل ان کو ہنساتی ہے بہار

کچھ سوائے گریہ جوں ابر اپنی قسمت میں نہیں
زعفراں ہی کیوں ہو مجھ کو رلاتی ہے بہار

غنچہ ہائے غم زدۂ مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

شرحِ کلامِ مومنؔ

غیر بے مروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھیں
زہرِ چشم دکھلائیں پھر ذرا مزا دیکھیں

غیر بے مروّت ہے یعنی نامہربان ہے۔اس لیے اس کی طرف آنکھ دکھانے کے انداز میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ مقصود آنکھ دکھانا نہیں بلکہ غیر کو دیکھنا ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ وہ غیر کو زہر بھری آنکھ یعنی غصے سے دیکھے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب غیر کی طرف اس انداز سے دیکھنے کا اظہار کرتا ہے جیسے کسی بے مروت کو دیکھ رہا ہو۔ عاشق اس کے مصنوعی انداز کو سمجھتا ہے۔لہٰذا وہ زہر چشم یعنی حقیقی غصے سے دیکھنے کی بات کرتا ہے تاکہ محبوب کو سمجھ میں آجائے کہ کون اس کی ناز برداری کرنے کے لائق ہے۔

کب تلک جئیں یارب ہجرِ غیرتِ مہ میں
صبح اٹھ کے منہ کب تک آفتاب کا دیکھیں

ہجر غیرتِ مہ یعنی چاند کو شرما دینے والے معشوق کی جدائی میں کب تک زندہ رہیں۔ صبح اٹھ کر کب تک سورج کا منہ تکتے رہیں، یعنی سورج غروب ہو اور رات آئے کہ معشوق کا وصل نصیب ہو سکے۔ محبوب کی جدائی میں دن گزارنا آسان نہیں۔ کاش جلد شام ہوتا کہ اس سے ملاقات کی صورت نکلے۔

ناصح ان کو گر میری شکل سے تنفّر ہے
تو بھی کم نگاہی کیوں جانب وفا دیکھیں

اے نصیحت کرنے والے اگر ان کو میری شکل اچھی نہیں لگتی تو ٹھیک ہے۔ صرف اس وجہ سے میں تنگ نظر ہو جاؤں، یہ اچھی بات نہیں۔ عشق تو یہ ہے کہ اس کے تنفر کے باوجود وفا کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ منفی پہلو پر توجہ دینا کم نگاہی ہے۔ وفا کا تقاضا تو یہ ہے کہ مثبت پہلوؤں پر نگاہ رکھیں۔

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح
گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

محبت میں گرفتار ہونے کے بعد سوائے محبوب کے کچھ نظر نہیں آتا۔ دنیا و مافیہا سے عاشق ایسا بے خبر ہو جاتا ہے کہ ناصح کے پند و نصائح بھی بے سود ہو جاتے ہیں۔ اے ناصح اگر تمھیں یقین نہیں آتا تو یہ تمھاری ناتجربہ کاری ہے۔ ایک بار کسی سے محبت کرلو، پھر خود معلوم ہو جائے گا کہ میں محبوب کے سوا ہر چیز سے کیوں بے نیاز ہو گیا ہوں۔

غیر کو دکھاتا ہوں چاک دل تماشا ہو
گر وہ روزنِ در سے آن کر ذرا دیکھیں

چاکِ دل یعنی اپنا کٹا پھٹا دل غیروں کو دکھاتا ہوں۔ حالانکہ مقصود غیروں کو دکھانا نہیں ہے۔ میں اس امید پہ ایسا کر رہا ہوں کہ محبوب روزنِ در یعنی دروازے کے سوراخ سے کبھی جھانکے اور میرے دل کی حالت سے آگاہ ہو جائے تو لطف آ جائے گا۔ یہاں تماشا، لطف کے معنی میں ہے۔ لطف سے مراد یہ ہے کہ دل کی حالت غیروں کو دکھانے کے بہانے محبوب پر واضح ہو، تاکہ وہ مہربان ہو جائے۔

چشم وا نے نابینا کر دیا جدائی میں
کوئی آنکھ لگتی ہے خوابِ وصل کیا دیکھیں

جدائی کی شدت ایسی ہے کہ آنکھیں نہ جھپکتی ہیں اور نہ ہی بند ہوتی ہیں، بس مسلسل کھلی رہتی ہیں۔ نتیجتاً یہ پتھرا کر بینائی سے محروم ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آنکھ بند ہی نہیں ہوتی تو نیند کا سوال کہاں اٹھتا ہے اور جب نیند نہیں آتی تو خواب میں ملاقات کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ انتظار میں آنکھیں ایسی پتھرائی ہیں کہ بینائی اور نیند دونوں سے محروم ہو گئیں۔ یعنی نہ جاگتے میں دیدار کی امید اور نہ ہی خواب میں ملاقات کی گنجائش ہے۔

دیکھیے خدا کب تک پھر وہ دن دکھائے گا
یار کو ان آنکھوں سے غیر پر خفا دیکھیں

عاشق کو یہ امید ہے کہ خدا وہ دن ضرور دکھائے گا جب محبوب پھر اس کی طرف ملتفت ہوگا اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ وہ اغیار جو آج توجہ پا کر خوش ہیں، محبوب کی خفگی کا شکار ہوں گے۔

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی
تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں

میں محبوب کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہوں اور اس عمل میں رسوا بھی ہونا پڑے تو کوئی پروا نہیں۔ میری تمنا تو صرف یہ ہے کہ محبوب اس طرف دیکھے تو اسے معلوم ہو جائے کہ میری نگاہ اسی پر لگی ہوئی ہے۔ عاشق کو نہ رسوائی کا خوف ہے اور نہ ہی دنیا سے مطلب، اسے تو صرف محبوب کی رضا چاہیے۔ اس کی خود سپردگی کے جذبے سے محبوب واقف ہو جائے اور بس۔

کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے
دیکھنا اِدھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں

مجھ سے نظریں ملا کر دیکھ پھر یہ اندازہ لگے گا کہ کس نے غیر کی طرف دیکھا ہے اور کس کی آنکھ جھپکی ہے۔ عاشق کی خود سپردگی ایسی ہے کہ اس نے غیر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور شدتِ انتظار میں اس کی آنکھ تک نہیں جھپکی، بس ٹکٹکی باندھے سراپا انتظار بنا ہوا ہے۔ اس کے برعکس محبوب میں نہ ایسی خود سپردگی ہے اور نہ ہی وہ شدتِ انتظار۔

وہم عاشقی سے تو یہ ستم نہ کرتا ہو
کیوں نگاہِ حسرت سے چرخ کو سدا دیکھیں

حسرت بھری نگاہ سے ہم کیوں آسمان کی طرف دیکھیں۔ کہیں اسے بھی میری عاشقی کا دھوکا نہ ہو گیا ہو، کیوں کہ وہ ستم پر آمادہ رہتا ہے۔ یعنی ستم کے لیے آسمان بھی مشہور ہے اور محبوب بھی۔ یہاں آسمان کے ستم گر ہونے کی تاویل یہ پیش کی گئی ہے کہ جس طرح محبوب اپنے عاشق پر ستم کرتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آسمان بھی اس وہم میں مبتلا ہو گیا ہو کہ میں اس کا عاشق ہو گیا ہوں۔ اس لیے اسے ہمیشہ تکتے رہتا ہوں اور وہم کی وجہ سے اس نے محبوب کا شیوۂ ستم گری اختیار کر لیا ہو۔

نکلے آرزو اپنی مومن آہ جب تجھ کو
صحنِ بتکدہ میں ہم خاک پر پڑا دیکھیں

اے مومن ہماری آرزو تب پوری ہوگی جب تجھے اس حال میں دیکھیں کہ تو محبوب کے صحن میں خاک پر پڑا ہوا ہے۔ یعنی دیوانگی کی انتہا مطلوب ہے کہ محبوب کے عشق میں عاشق اس قدر از خود رفتہ ہو چکا ہے کہ صحن میں محبوب کے بے ہوش وحواس پڑا ہوا ہے۔

بزم میں اس کی بیانِ دردِ غم کیوں کر کریں
وہ خفا جس بات سے ہووے وہ ہم کیوں کر کریں

دردو غم کا اظہار عاشقوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ عاشق تو صرف صبرو استقلال اور ضبط وتحمل کا پیکر ہوتا ہے۔ محبوب کو بھی اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ اس کی بے التفاتی اور صرفِ نگاہی کے باوجود اس کا سچا عاشق اپنے لبوں پر حرفِ شکایت نہیں لائے گا۔ ایسی صورت میں کسی عاشق کے شکوے گلے پر محبوب کا خفا ہونا لازمی ہے۔ یہ عمل محبوب کی بزم میں ہو تو اس کی ناراضگی میں کیا کسر رہ جائے گی۔ اس شعر میں محبوب کا مزاج شناس اور عاشق کے تقاضوں کا واقف کار عاشق یہی تہیہ کرتا ہے کہ غم کا درد خواہ کتنا ہی شدید ہو جائے ہم اس کا اظہار کر کے محبوب کو خفا نہیں کر سکتے۔ گویا عاشق کا مقصود ہر حال میں محبوب کی رضا ہے۔

مجھ پہ بعد امتحاں بھی جور کم کیوں کر کریں
وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیوں کر کریں

میری عاشقی کا امتحان لینے کے بعد بھی وہ مجھ پر ظلم کیوں کم کریں اور غیروں کو ستائیں، وہ ایسا ستم کس طرح کریں۔ مطلب یہ ہے کہ میں امتحان کے بعد بھی بے التفاتی کا ہی شکار ہوں، جب کہ غیر امتحان سے گزرے بغیر اس کی نوازشات سے سرشار ہے۔ مرے عشق کے امتحان کے بعد غیروں سے میل جول میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لہٰذا عاشق پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہوسکتا کہ غیر پر محبوب کی توجہ ہو۔

لکھتے لکھتے ہی سیاہی حرف سے اُڑ جائے ہے
ہائے احوالِ دلِ مضطر رقم کیوں کر کریں

احوالِ دل مضطر یعنی بے چین دل کے حالات اس قدر طویل ہیں کہ بیان کرتے کرتے مدت گزر جاتی ہے۔ اتنی طویل مدت کہ حرف کی سیاہی اڑ جاتی ہے۔ آگے میں لکھتا جاتا ہوں اور پیچھے کے حالات مٹتے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پریشان دل کے احوال کیوں کر رقم کیے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ محبوب تک میرے دل کے مکمل کوائف پہنچنے کا امکان نہیں۔

گر نگاہِ ناز کو مشقِ ستم منظور ہے
دشمن اپنی نرگسِ تربت قلم کیوں کر کریں

نرگسِ تربت قلم کرنا یعنی قبر پر نرگسی آنکھ جیسا نقشہ درمیان میں بنانا۔ محبوب کی نگاہِ ناز مجھ پر ستم ڈھانے کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا دشمن کو اپنی قبر پر آنکھ بنانے کی ضرورت نہیں۔

دیکھ لیوے عکسِ رخ تو کیا بنے پھر دیکھ تو
گریہ اس کے سامنے اے چشمِ نم کیوں کر کریں

وہ اپنا عکسِ رخ یعنی چہرے کی تصویر میری بھیگی آنکھوں کے پردے پر دیکھ لے، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ اے چشمِ نم اس کے سامنے کیوں کر روئیں۔ اگر آنکھیں اشک ریز ہو گئیں تو محبوب اس میں اپنے چہرے کا عکس نہیں دیکھ پائے گا۔ اس لیے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہی اس کے روبرو ہونا ہے تاکہ وہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ لے اور میرا فائدہ یہ ہے کہ میں ان آنکھوں میں اس کا عکس محفوظ کر لوں گا۔

اضطرابِ شوق شاید غیر اُس کے پاس ہو
جانبِ چلون نظارہ دم بدم کیوں کر کریں

اسے اضطرابِ شوق یعنی خواہشِ دید کی بے چینی۔ محبوب شاید اس لیے چلون کی طرف نہیں آ رہا ہے کہ ممکن ہے کوئی غیر اس کے پاس موجود ہو۔ محبوب کا شیوہ تو یہ تھا کہ نظارے کے لیے بار بار چلون کی طرف آتا تھا۔ آج کیا بات ہے کہ اس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ ہو نہ ہو وہ غیر کی صحبت میں مصروف ہے۔

ہے شبِ فرقت میں مرگ افسانہ خواں بے فائدہ
نام آرام آگیا خوابِ عدم کیوں کر کریں

ہجر کی رات موت کے مترادف ہے اس لیے دوسرے قصے سنانے کا کوئی حاصل نہیں۔

موت کی صورت میں چین نصیب ہوگیا۔ اب نیستی کے خواب کیا دیکھنا۔ یعنی موت باعثِ آرام ہے اور محبوب کی آمد عدم کی طرح۔ لہٰذا اس کے آنے کا خواب دیکھنا بے کار ہے۔ میرے اضطراب اور فرقت کے کرب کا علاج موت نے کردیا۔

دیکھ پیچ و تاب سنبل ہوگیا دل بے قرار
اب نہاں سودائے زلفِ خم بہ خم کیوں کر کریں

پیچ و تابِ سنبل یعنی سنبل کی بے قراری دیکھ کر اپنا دل بھی بے قرار ہوگیا۔ اب محبوب کی خمدار زلف کی دیوانگی کو کیا چھپانا۔ سنبل کے پیچ و تاب کو دیکھ کر عاشق کو یہ حوصلہ مل گیا ہے کہ محبوب کی پیچ دار زلف میں اسیر ہونے کا جو جذبہ مدتوں سے اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا، اس کا اظہار کر سکے۔

سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا
ہم بھی تو مومن ہیں دل نذرِ صنم کیوں کر کریں

اس دنیا میں ہر کوئی اپنے نام کا لحاظ رکھتا ہے اور اپنا وقار بچانا چاہتا ہے۔ ہم بھی مومن یعنی ایمان والے ہیں تو پھر اپنے دل کو اس بت کے حوالے کیسے کریں کیوں کہ ایمان والا صنم کی پرستش نہیں کرتا اور ہمارا نام ہی مومن ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنے نام کا بھرم رکھیں اور دل اس بت کے حوالے کرنے سے باز رہیں۔

نہ تن ہی کے ترے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں
ہے پاش پاش جگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

بسمل یعنی زخمی، تڑپنے والا مراد عاشق۔ تیرے عاشق کا صرف جسم ہی ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہے، بلکہ جگر بھی چور چور ہے اور دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ یعنی عاشق اپنے محبوب کے ناز و ادا سے اس طرح گھائل ہوا ہے کہ جسم، یعنی صرف ظاہر ہی ریزہ ریزہ نہیں ہوا ہے بلکہ باطن کے بھی پرزے پرزے ہوگئے ہیں۔

جنونِ عشق پری روے دل شکن ہے بلا
کہ روز طوق و سلاسل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

دل توڑنے والے پری چہرہ محبوب کے عشق کا جنون یعنی پاگل پن بلا ہے۔ غضب ہے کہ اس کے طیش سے طوق یعنی گلے میں پڑے ہوئے حلقے اور سلاسل یعنی پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے روزانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ محبوب کی دل شکنی نے عاشق کے جنون کو وہ سلیقہ اور حدت عطا کردی ہے کہ قید و بند کی ساری کوششیں بے کار ہیں۔

اٹھا کے سوتے میں دے پٹکا رات سر شاید
کہ زیرِ سر کے مرے سِل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

وفورِ اضطراب اور شدتِ جنوں میں رات سر کو سِل پہ اس طرح پٹکا کہ سِل کے ٹکڑے ہو گئے۔ لفظ شاید سے بھی ظاہر ہے کہ عاشق کو اس عمل کا نقصان تو دور، احساس تک نہیں ہوا۔ وہ تو اپنے سر کے نیچے کے پڑے ہوئے سِل کے ٹکڑوں پہ قیاس لگا رہا ہے کہ ممکن ہے اس رات اس نے سِل پر اپنا سر دے مارا ہو۔

یہاں ہے چاک گریباں تو واں یہ حالت ہے
قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

شدتِ جنون کے باعث اگر عاشق نے اپنا گریباں چاک کرلیا ہے تو اس شوخ شمائل شریر خصلتوں والے، مراد محبوب کی قبا بھی سلامت نہیں۔ اس نے بھی فرطِ محبت میں اپنی قبا کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے ہیں۔ یعنی عاشق اور محبوب دونوں کے سینے میں عشق کی آگ برابر لگی ہوئی ہے۔

دراز دستی یہ کس بے ادب نے کی دمِ قتل
تمام دامن قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

محبوب کا شیوہ قتل کرنا ہے اور عاشق کی شان یہ کہ اس کی مرضی کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردے۔ لیکن یہ کون سا عاشق تھا جس نے دمِ قتل آدابِ عشق کا پاس نہ رکھنے کی گستاخی کی ہے یعنی محبوب کا دامن تار تار ہو گیا۔ عاشق نے محبوب کی مرضی کے خلاف دراز دستی کرنے کی بے ادبی کی۔

یہ کس کی چشمِ فسوں گر نے کی فسوں سازی
طلسمِ جادوئے بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

چشمِ فسوں گر، جادو ایجاد کرنے والی آنکھ، یعنی محبوب کی آنکھ نے ایسا جادو کیا کہ اہلِ جادو کا نقش بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ محبوب کی آنکھ میں ایسا جادو ہے کہ بڑے سے بڑا جادوگر کا وجود بھی

بے اثر ہو جاتا ہے۔

یہ بے حجابی بُری گو مجھی کو جھانکو تم
کہ روز پردۂ حائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

بے پردگی اچھی چیز نہیں ہے، کیوں نہ تم مجھ کو ہی دیکھو۔ تمھاری تاک جھانک سے درمیان میں پڑا پردہ روزانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ یعنی پردے کے آداب مجروح ہو رہے ہیں۔ عاشق کی غیرت یہ گوارا کرنے کو راضی نہیں کہ محبوب بے پردہ ہو خواہ وہ اسی کی دید کے لیے کیوں نہ ہو۔

کہے نہ ملنے کی اُس سنگِ دل کی گر قاصد
تو سنگ و سر ابھی یاں مل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

قاصد اگر یہ خبر لائے کہ وہ سنگ دل یعنی پتھر دل محبوب ملاقات کے لیے راضی نہیں تو میں اس خبر کی تاب نہیں لا سکتا اور اپنے سر کو پتھر سے ٹکرا ٹکرا کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرلوں گا۔

نہ کیوں کر رشک سے ہو خوں کسی کا اس در پر
ہمیشہ اک نئے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

محبوب کے در پر قتل ہونا رشک کی بات کیوں نہ ہو۔ اس در پہ تو ہمیشہ کسی نہ کسی بسمل یعنی زخمی عاشق کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں۔ محبوب میں اتنی کشش ہے کہ اس کے ہاتھوں قتل ہونے میں عاشق فخر محسوس کرتا ہے۔

غزل سرائی کی مومن نے کیا رشک سے آج
چمن میں سینے عنادل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

مومنؔ نے آج اس انداز سے غزل پڑھی کہ مارے رشک کے باغ کی بلبلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، یعنی اس غزل سرائی پر انھوں نے اپنی جان نچھاور کر دی۔

☆☆☆

کلام مومن کی شرح

مانے نہ مانے منعِ تپشہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

منع تپشہائے دل، یعنی دل کی جلن کے اظہار سے باز رہنا۔ مطلب یہ کہ جس کے لیے دل میں یہ اضطراب ہے، وہ راضی ہو، یا نہ ہو میں اس کا اظہار نہیں کروں گا۔ چونکہ میں اپنا ہوں اور اپنے ہر حال میں پردہ داری کرتے ہیں، تماشا تو غیر بناتے ہیں۔ تماشائے دل کا مطلب ہے کہ جو دل میں بسا ہے اس کا بھی تماشا ہوگا اور ایسا کرنا غیروں کا شیوہ ہے۔

ہو جان بھی جائے تو مُداوائے دل کروں
کب تک میں دل پہ ہاتھ دھرے ہائے دل کروں

دل کا علاج یہی ہے کہ اس کا مطلب حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے جان ہی کیوں نہ گنوانی پڑے۔ پھر یہ بھی کہ دل پہ ہاتھ دھرے ہائے ہائے کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ جان دے کر اس کا صحیح مُداوا کیا جائے۔ ظاہر ہے مایوسی اور نامرادی کی پوری عمر سے بہتر چند لمحے کی حصولیابی اور مسرت ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جو بیمار دل اور آہ وزاری کے ساتھ گزاری جائے۔

سو طرح کے زیاں ہیں رہنے میں اس کے گر
دشمن بھی مفت لے تو میں سودائے دل کروں

دل ہے تو اضطراب ہے، پریشانی ہے، خلفشار ہے، گویا ایک دل کی وجہ سے سو خسارے

ہیں۔ ان خساروں سے نجات کی صرف یہی صورت ہے کہ اسے محبت آشنا کردیا جائے۔ سودائے دل سے مراد دل کو اس کی فطرت پہ ڈالنا ہے۔ دل کی فطرت دیوانگی، محبت اور خواہش ہے۔ اگر ان میں سے کچھ بھی دل کی پونجی نہ ہو تو یہ مضطرب رہے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ سودائے دل کرلیا جائے، خواہ دشمن کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔

مرتا ہوں کس عذاب سے ہے وقت جی میں ہے
اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

تمنائے دل کی دعا کرنا سے مراد یہ ہے کہ دل آرزوؤں سے خالی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دل تمناؤں اور آرزوؤں سے خالی ہو تو وہ مردہ ہے، جو عذاب سے کم نہیں۔ اس جان لیوا عذاب سے نجات کے لیے بہتر ہے کہ خدا کی بارگاہ میں یہ دعا کی جائے کہ دل دنیا کی تمناؤں سے آباد ہو جائے۔ شاید دعا کے لیے یہ مناسب گھڑی بھی ہے۔

جاں دے دوں ہے اُس آفتِ جاں سے معاملہ
بس کب تلک انتظارِ تقاضائے دل کروں

آفتِ جاں: جان کی مصیبت یعنی محبوب، تقاضائے دل یعنی دل کی خواہش، چاہت دل کی خواہش یہ ہے کہ محبوب حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس محبوب ہے کہ اسے کچھ پروا نہیں اور اس کی یہ بے التفاتی جان کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ اب اس مصیبت سے چھٹکارے کی یہی صورت ہے کہ جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ چونکہ محبوب ہے کہ اپنی بے التفاتی کی روش پہ قائم ہے اور دل ہے کہ اس کی خواہش سے باز نہیں آتا۔ گویا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ زندگی کا قصہ تمام کرلوں۔

میں اور وہ کوچہ لے گیا کس جائے ظلم ہے
اِس پر بھی گر شکایتِ بے جائے دل کروں

دل نے مجھ پر یہ ظلم کیا کہ ایسے کوچے کی خاک چھاننے پر مجبور ہوا جو میرے لائق نہیں تھا۔ پھر بھی اگر میں شکوہ کروں تو یہ بے جا ہے۔ یعنی دل کے معاملے میں عقل کا استعمال بے جا ہے۔ دل نے جس کوچے میں ڈالا ہے وہ کوچۂ محبوب ہے اور اب خواہ غم حاصل ہو یا مسرت، یہ محبوب کی مرضی پر منحصر ہے۔ لہٰذا گلے شکوے بے کار ہیں۔

چھٹتا ہے جیتے جی کوئی زنجیرِ زلف سے
دیوانہ ہوں کہ چارۂ سودائے دل کروں

زلف کی زنجیر سے رہائی مرنے کے بعد ہی ممکن ہے، جس پر فرزانگی قربان ہوتی ہے۔ اس لیے شاعر نے اس دیوانگی سے نجات پانے کی کوشش کو ہی دیوانگی سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس مرض کی تدبیر کا امکان ہی نہ ہو، اس کے علاج کی کوشش میں جان کھپانا کسی طرح بھی عقلمندی کا کام نہیں، یہ سراسر دیوانگی ہے۔

بے رحم ہرزہ گردیوں سے پاؤں گھس گئے
کیا ذکر، جوشِ حوصلہ فرسائے دل کروں

ہرزہ گردی یعنی فضول مارے مارے پھرنا اور حوصلہ فرسائے دل یعنی ایسا دل جو اپنا حوصلہ کھو بیٹھا ہے۔ میں ایسی کوشش میں سرگرداں ہوں جس کا کچھ حاصل نہیں۔ فضول پھرتے رہنے سے میرے پاؤں گھس گئے ہیں۔ اب دل بھی حوصلے سے خالی ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایسے دل کا کیا ذکر جس میں جوش باقی ہے اور نہ ہی حوصلہ۔ حوصلے کی بات تو چھوڑ دیجیے، اب دل کی حالت یہ ہے کہ میری حوصلہ افزائی نہیں، بلکہ حوصلہ شکنی پر آمادہ ہے۔

دھبّا لگا ہے شوقِ سیہ کارِ زلف کو
اللہ کیا علاج سویدائے دل کروں

زلفِ سیاہ کی اسیری نے اس قدر اثر دکھایا ہے کہ دھبے کی شکل میں دل پر بھی اثر انداز ہو گیا ہے۔ یا اللہ ایسے داغِ دل کا کیا علاج کروں جو سیہ کاریِ زلف کا نتیجہ ہو۔ داغِ دل کا علاج تب ممکن تھا جب وہ مرض ہوتا۔ یہ تو زلفِ سیہ کا داغ ہے جو دل پر جم گیا ہے۔ نہ ہی میں اس زلف سے آزاد ہو سکتا ہوں اور نہ ہی داغِ دل کا علاج ہو سکتا ہے۔

اُس بت کو ترکِ دیں سے نہیں مومن اعتماد
کیوں کر نہ میں شکایت اغوائے دل کروں

محبوب کی خاطر میں نے دین کو بھی ترک کر دیا، لیکن محبوب کو پھر بھی میری عاشقی پر بھروسہ نہیں۔ ظاہر ہے جب محبت پر اعتماد نہ ہوگا تو بے التفاتی لازمی ہے۔ گویا میں دین اور دل دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا، لیکن محبوب ہے کہ بے اعتمادی کی وجہ سے نظر انداز کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ایسی

حالت میں دل کے اغوا کر لینے کی شکایت کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔

بے مزہ ہو کر نمک کو بے وفا کہنے کو ہیں
کھل گئے زخموں کے منہ کس کو برا کہنے کو ہیں

نمک کی وفاداری یہ ہے کہ وہ اپنا کام کرے یعنی زخموں کو تازہ کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ بے وفا ہے۔ پہلے مصرعے میں یہی بات کہی گئی ہے کہ نمک اپنا کام فراموش کر چکا ہے۔ لہٰذا میں اسے بے وفا کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں نمک نے اپنا اثر دکھایا اور زخم تازہ ہو گئے۔ لہٰذا شاعر فوراً معذرت خواہ ہوتا ہے کہ میں بے کار ہی نمک کو بے وفا کہنے والا تھا۔ اس نے تو اپنا کام کر دیا، یعنی زخموں کے منہ کھل گئے۔

سب جفا جو اُس ستم گر کے سوا کہنے کو ہیں
جن کو چرخِ مرگ کہتے ہیں ستا کہنے کو ہیں

اس ستم گر یعنی محبوب کے ظلم وستم کی ادا ایسی ہے کہ دوسرے تمام ظلم وستم محض کہنے کی باتیں ہیں۔ آسمان، جس کا ظلم باعث مرگ ہوتا ہے، اس کے ظلم کے سامنے سنا ہے کہ صرف کہنے کے لیے ہے۔ محبوب کے ظلم وستم کی ایسی ادا ہے کہ اس کے سامنے سارے ظلم ہیچ ہیں۔ یہاں تک کہ چرخ مرگ بھی اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ کیوں کہ اس کے ظلم سے موت واقع ہو جاتی ہے اور انسان ظلم سے نجات حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس ستم گر کا ظلم تو ایسا ہے جو نہ جینے دیتا ہے اور نہ ہی مرنے دیتا ہے۔

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدّعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

سینے میں غم واندوہ اس قدر ہے کہ کوشش تو آرزو کے اظہار کی ہے، لیکن لبوں سے آہ وزاری نکلتی ہے۔ گویا اب اپنے لب بھی اختیار میں نہیں کہ کہنا کچھ چاہتا ہوں اور یہ ادا کچھ کرتے ہیں۔ یعنی عاشق اس قدر فرطِ غم اور اضطراب کا شکار ہے کہ دل، دماغ اور زبان اپنا توازن کھو چکے ہیں۔ دل کچھ چاہتا ہے اور زبان کچھ کرتی ہے۔ ایسی صورت میں جب ہونٹ اختیار سے باہر ہو چکے ہوں، کیا پتا ان سے کب کیا سرزد ہو جائے۔

تیری تیغِ دوشنہ کے لب پہ چھالے ہو گئے
گرم خونی کا مری کیا ماجرا کہنے کو ہیں

شمشیر کے لب پر چھالے پڑنا، یعنی اس کا قتل کے لائق نہیں رہنا۔ چھالے کی مناسبت سے گرم خونی کا استعمال کیا گیا ہے۔ عاشق کے خون میں اتنی گرمی ہے کہ تلوار اسے قتل کیا کرتی، شدتِ گرم خونی کے باعث اس کی زبان یعنی دھار پہ چھالے پڑ گئے اور وہ ارادے سے نہ صرف باز آ گئی، بلکہ اس کا سکوت یہ ظاہر کرتا ہے کہ عاشق سارا ماجرا بیان کرنے والا ہے۔

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

دوست جھڑکنے لگے ہیں اور غیر شکوہ شکایت پر آمادہ ہیں۔ یعنی اپنے اور کیا بیگانے، سب مجھ ہی کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اب میری حالت ایسی ہے کہ ہیں کہیں کا نہیں رہا۔ آخر میرے دوست اور دشمن اسے کچھ کیوں نہیں کہتے، جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی کہ میں دوستوں سے لاتعلق ہو گیا اور غیروں کی نظر میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ جب کہ دوستوں سے لاتعلقی اور غیروں کی نظر میں کانٹے بننے کی وجہ وہی ہے۔

ترجمانِ التماسِ شوق ہے تغییر رنگ
جوں زبانِ شمعِ عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

میرے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ تمناؤں کے عرض کرنے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یعنی جو آرزوئیں میرے دل میں ہیں اور ان کا اظہار زبان سے نہ کر پانے کے سبب میرے چہرے پر الگ الگ کیفیت ابھر رہی ہے۔ جس طرح شمع کہنے کو بے صدا ہے، اور خاموشی سے جلتی رہتی ہے، لیکن اس کی لو کا بدلتا ہوا رنگ اس کی کیفیت بیان کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح عاشق کی حالت بھی ہے۔ اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ اس کی کیفیت بیان کر رہا ہے۔ دونوں خاموشی سے اپنا وجود پگھلاتے رہتے ہیں، لیکن زبان پر حرفِ تمنا نہیں آنے دیتے۔

جل گیا دل تو بھی اٹھتا ہے دھواں سر سے کہ اب
مرثیہ ہم اس چراغِ کشتہ کا کہنے کو ہیں

دل بجھ چکا ہے، یعنی تڑپ کر خاموش ہو چکا ہے، لیکن سر سے اب بھی دھواں اٹھ رہا ہے،

یعنی دل مایوس ہو چکا ہے اور سر میں اس کا سودا سمایا ہوا ہے۔ گویا میرا پورا وجود اس چراغ کشتہ یعنی دل کا مرثیہ بن گیا ہے۔ محبوب کی بے اعتنائیوں سے دل بے کیف ہو چکا ہے اور دماغ ہے کہ اسی طرف لگا ہوا ہے۔ نتیجتاً میں چلتا پھرتا مرثیہ یعنی لاش بن چکا ہوں۔

دیکھنا کس حال سے کس حال کو پہنچا دیا
بخت تیرے عاشقوں کے نارسا کہنے کو ہیں

تیری عاشقی نے عاشقوں کا مقدر چمکا دیا۔ کل وہ کیا تھے اور آج کیا ہو گئے۔ یہ صرف کہنے کی بات ہے کہ عاشقوں کی تقدیر رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ بہ ظاہر تیری بے التفاتی اور عاشقوں کا اضطراب یہ لگتا ہے کہ سب ناکام ہو گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ناکامی بھی عشق کی حصولیابی ہے کہ اس کی وجہ سے عاشقوں کو عشق کا سرمایہ دستیاب ہوا ہے۔

ایک دن کو تو زبانِ شعلہ دوزخ قرض دے
قصۂ شبہائے غم روزِ جزا کہنے کو ہیں

غم کی راتیں جس سوزش اور تڑپ میں گزری ہیں، ان کا قصہ بیان کرنے کے لیے یہ زبان کافی نہیں ہو سکتی۔ اس قصے میں اتنا سوز ہے کہ دوزخ سے اس کی شعلہ زبانی قرض لیے بغیر بیان نہیں ہو سکتا۔ آج روزِ جزا یعنی محبوب سے صلہ پانے کا دن ہے۔ لہٰذا اس کے لیے میں نے جتنی اذیتیں برداشت کی ہیں، سب کا اظہار ضروری ہے تاکہ پورا پورا بدلہ مل سکے۔

شکوہ حرفِ تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں

حرفِ تلخ یعنی ترش اور ناگوار بات، شور بختی یعنی بدقسمتی۔ آج میں تلخ کلامی کا شکوہ اور بدقسمتی کا گلہ کرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے یہ دونوں باتیں لذت سے خالی ہیں۔ یعنی آج نہ میں ضبط سے کام لے کر تیری دلجوئی اور تعریف کرنے والا ہوں، اور نہ ہی اپنی خرابی قسمت پر صابر و شاکر رہنے والا ہوں۔

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تُو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

میں اپنی کمیوں اور خرابیوں کی شکایت خود تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تم غیروں کی

باتیں سننے کی زحمت کیوں کررہے ہو۔ظاہر ہے وہ بھی تم سے میری شکایت ہی کریں گے۔اس کے علاوہ ان کے پاس کہنے کو کیا ہے۔کم از کم جب تک تم مجھ سے شکایت سنو گے،میری طرف متوجہ رہو گے۔ دوسروں سے سننے میں میرا یہ نقصان ہے کہ تمھاری توجہ ان کی طرف ہوگی۔لہٰذا اپنی شکایت میں خود پیش کردیتا ہوں۔

وہ نہیں آتے نہ آویں مرگ ظالم تو تو آ
یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

محبوب کے آنے پر شوق وتمنا کے لب خوش آمدید کہنے کو مضطرب ہیں۔حالانکہ محبوب ہے کہ آنے کا نام نہیں لیتا۔اب خوش آمدید کہنے کے شوق کا پیمانہ ضبط لبریز ہو چکا ہے۔اے موت تو کیوں ظلم کررہی ہے۔محبوب نہیں آتا نہ آئے۔تم تو آجاؤ۔میں تمھیں ہی مرحبا کہہ کر سینے سے لگالوں گا۔

غیر سے سرگوشیاں کرلیجیے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہے

محبوب غیر سے محوِ گفتگو ہے اور عاشق کا دل رشک میں مبتلا ہے کہ کاش وہ مجھ سے بھی سرگوشی کرے۔لہٰذا وہ گزارش کرتا ہے کہ ٹھیک ہے آپ غیر سے سرگوشی کررہے ہیں،کرلیجیے۔ادھر سے فرصت مل جائے تو میرا دل رشک بھی اپنی آرزوئیں بیان کرے گا۔

تیغِ غمزہ کو لگالے جلد سنگِ سرمہ پر
حرفِ مطلب آرزو مندِ جفا کہنے کو ہیں

تیغِ غمزہ یعنی اشاروں کی تلوار کو سرمہ کے پتھر پہ لگا کر اسے اور بھی تیز کرلے۔اس لیے کہ تیری جفا کے طلب گار اپنی خواہش کا اظہار کرنے والے ہیں۔ظاہر ہے کہ جفا کے آرزو مند کی تمنا یہی ہوگی کہ محبوب اپنی آنکھوں کے اشارے کی تلوار سے قتل کردے اور تلوار جس قدر دھار دار ہوگی،جفا یعنی قتل کا لطف اسی قدر دو بالا ہوگا۔

ہوگئے نامِ بتاں سنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

خوبصورت معشوق کا نام سنتے ہی مومن بیقرار ہوگئے۔میں کہتا تھا کہ ان کی پارسائی محض

ریاکاری ہے۔ وہ صرف کہنے کو لوگوں کی نظر میں پارسا بنے ہوئے ہیں، ورنہ ان کے اندر بھی ایک عاشق چھپا ہوا ہے۔ آخر کار یہ بات سچ نکلی کہ جیسے ہی محبوب کا نام آیا، ان کے اندر کا عاشق بیدار ہو گیا اور مضطرب ہو اُٹھے۔

وہ علی الرغمِ عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں
ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

وہ علی الرغم عدو یعنی دشمن کے برعکس مجھ پر کرم کرتے ہیں۔ کیوں کہ دشمن کرم نہیں کرتا وہ تو ظلم کرتا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ یہ کرم دراصل ان کے ستم کرنے کے طریقے کی ایجاد ہے۔ بہ ظاہر تو یوں لگتا ہے کہ وہ مجھ پر مہربان ہیں لیکن ان کی مہربانیوں کے پس پردہ ستم ہی ستم ہے۔ محبوب ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر جان لینے میں مشاق ہے۔

طلبِ وصل کس انداز سے ہم کرتے ہیں
شوق نامہ اسے وصلی پہ رقم کرتے ہیں

محبوب سے ملاقات کی آرزو کا میرا کتنا انوکھا انداز ہے۔ اپنی خواہش کا اظہار خط کے ذریعہ نہیں کر سکتے تو وصلی یعنی وہ تختی جس پہ کاغذ رکھ کر لکھتے ہیں، اسی پر اپنی آرزو یا خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وصلی پر اپنے دل کی بات رقم کر کے اسے اس طرح رکھتے ہیں کہ محبوب کی نظر بھی پڑ جائے اور راز فاش بھی نہ ہو۔

جب ترے کوچہ کا بیتابیِ دل سے پھرنا
یاد آتا ہے زمیں بوس قدم کرتے ہیں

مضطرب ہو کر محبوب کی گلی کا چکر لگانا یاد آتا ہے تو میں اپنے پیروں کو فرطِ محبت اور ادب سے چوم لیتا ہوں۔ مجھے ان پیروں پر رشک آنے لگتا ہے کہ کوچۂ محبوب کی گردش کا اسے بے شمار شرف حاصل ہے۔

نیم بسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپشِ دل کہ ابھی
روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

نیم بسمل، آدھا ذبح کیا ہوا، یعنی ادھ مُوا۔ اے دل مرنے میں اتنی بیتابی نہ دکھا۔ جب تک

جان نہیں جاتی، قاتل یعنی محبوب کی دید ہوتی رہے گی۔ مطلب یہ کہ نیم مردنی کی حالت میں کچھ دیر عاشق اس لیے رہنا چاہتا ہے کہ محبوب کا چہرہ اس وقت تک سامنے رہے گا جب تک قتل کا عمل پورا نہیں ہو جاتا۔

اے اجل کاش الٹ جائیں شبِ ہجراں میں
وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

اجل یعنی موت، شبِ ہجراں یعنی جدائی کی رات، مطلب یہ کہ میں جو جان کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں، وہ اُلٹ جائیں یعنی بے اثر ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں موت آئے گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فرحت کی رات کی تکلیف سے موت اچھی ہے کہ اس کے آنے سے ہجر کی تکلیف سے نجات بھی حاصل ہو جائے گی۔

دم میں مت آئیو اے غیر کہ مانندِ صبا
جس سے لگ چلتے ہیں وہ اس سے ہی رم کرتے ہیں

اے رقیب! تم مطمئن مت ہو یا کسی خوش فہمی میں مت پڑو کہ محبوب تمھارا ہو گیا۔ معشوق کی تو صفت ہی یہ ہے کہ جس کی جانب محبت کی نگاہوں سے دیکھا، کچھ وقت کے بعد اس سے الگ ہو گیا، بالکل ویسے ہی جیسے صبا کی صفت ہے۔ ابھی ایک پھول کے پاس گئی، پل بھر میں دوسرے پھول کے پاس چلی گئی۔

محضرِ قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا
سرِ قاتل کو وہ فتوے سے قلم کرتے ہیں

محبوب کو لکھا گیا گنہگاروں کا یعنی عاشقوں کا خط، قتل ہونے کی درخواست ہے۔ محبوب یہی بہانہ بنا کر کہ انھوں نے قتل ہونے کی درخواست دی ہے، سر قلم کرنے کے فتوے صادر کرتا ہے۔ محبوب عاشق کے خط کو ایسے گناہ سے تعبیر کرتا ہے کہ جس کی سزا موت ہے۔

دیکھنا اُس دہن تنگ کے بوسہ کا مزا
کہ ہوسناک تمنائے عدم کرتے ہیں

دہنِ تنگ یعنی غنچہ دہن۔ چھوٹے منہ کے بوسہ کا لطف دیکھو کہ اس کی خواہش رکھنے والے اپنے آپ کو مٹا کر بھی اس کے بوسہ کی تمنا کرتے ہیں۔ غنچہ دہن یعنی محبوب کا بوسہ اپنے وجود اور

ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے۔ پھر بھی اہل ہوس اپنی ہستی پر محبوب کے بوسے کو فوقیت دیتے ہیں۔

ہائے قسمت کہ ہوئی مجھ پہ جفا اور فزوں
اِن دنوں غیر پہ گر لطف وہ کم کرتے ہیں

یہ سچ ہے کہ آج کل غیروں سے ان کی التفات میں کمی آئی ہے، لیکن یہ میری بدقسمتی کہ مجھ پر ان کا ظلم اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ گویا غیروں سے کم التفاتی کی صورت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مجھ پر وہ مہربان نہیں ہوتا، کم از کم ظلم میں تو کمی آتی، لیکن اس کے برعکس ان کا ظلم بڑھتا ہی چلا گیا۔

کشتۂ یار ہوں اِس رشک سے مرتا ہوں جہاں
وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

میں کشتۂ یار یعنی دوست کا قتل کیا ہوا ہوں۔ میری اس خوش نصیبی پر مجھے دنیا رشک بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے ان لوگوں پر جو میری موت سے غمزدہ ہیں۔ کیوں کہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا غم کی بات نہیں بلکہ عشق کی معراج ہے۔ جو عرفانِ عشق رکھتے ہیں وہ میری اس موت پر رشک کرتے ہیں اور جو نادان ہیں انھیں افسوس ہوتا ہے۔

کیا ہی بیزار ہے اس زیست سے بھی ہائے ستم
قتل کرتے نہیں وہ اور ستم کرتے ہیں

میرا محبوب میری زندگی سے قدر ناراض ہے کہ قتل نہیں کرتا، بس ستم کرتا ہے۔ یعنی محبوب اگر میری زندگی سے نالاں ہے تو چاہیے یہ کہ وہ قتل کر کے میرا قصہ تمام کر دے، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ ظلم و ستم کیے جاتا ہے۔ اس نے اپنی ناراضگی کا بدلہ لینے کے لیے انوکھی ترکیب نکالی ہے۔ قتل کر دینے میں اسے ظلم کرنے کا موقع کہاں ہاتھ آئے گا، لہٰذا وہ ستم پر ستم کرتا ہے۔

اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ
جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

میرے خرید و فروخت کا انداز مت پوچھو۔ صرف ایک دل اپنے پاس ہے اور اسے بھی پیشگی قیمت کے طور پر دینے کو تیار ہوں۔ خریدار یعنی محبوب کے ہاتھوں دل بیچ دینا ہی عاشق کا شیوہ ہوتا ہے۔ جب دل کا سودا مقصود ہو تو نفع و نقصان کی فکر نہیں ہوتی۔ آرزو صرف اتنی ہوتی ہے کہ

محبوب اسے قبول کر لے۔

آبرو رہ رگئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ
اشکِ شادی ہی ہے گو چشم کو نم کرتے ہیں

اشکِ شادی یعنی خوشی کے آنسو۔ میں نے محبوب کے لیے جان دے دی اور وہ فرطِ مسرت سے خوشی کے آنسو بہا رہا ہے، لیکن اس کا ایسا کرنا بھی میرے لیے عزت کی بات ہے کہ میری موت پر کم سے کم اس کی آنکھوں سے آنسو تو رواں ہوئے، خواہ وہ خوشی کے ہوں یا غم کے۔

جا کے کعبہ میں بھی مومن نہ گئی ڈیر کی یاد
جائے لبیک سدا ہائے صنم کرتے ہیں

دل سے دیر، یعنی بتکدے کی یاد کعبہ میں جا کر بھی نہیں نکالی گئی۔ حد تو یہ ہے کہ جس جگہ لبیک الہم لبیک کی صدا بلند کرنی تھی، ہم وہاں بھی صنم صنم پکارتے رہے۔ بہ ظاہر ہم نے پارسا بننے کی تو کوشش کی لیکن وہ بت ہمارے ذہن و دماغ پر اس قدر حاوی ہے کہ خدا کے گھر میں بھی اس کی یاد سے غافل نہ رہ سکے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد نثار

مومن کی شاعرانہ عظمت

اردو غزل کو سنوارنے اور اسے ایک نئی بلندی عطا کرنے والوں میں مومن خاں دہلوی کو ایک ایسا امتیاز حاصل ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مومن کے فن نے صنف غزل کی لطافت، جذبہ انگیزی اور اثر آفرینی کو اعلیٰ مہارت فن اور شاندار انفرادی روایات کے ساتھ نہ صرف نمایاں کیا ہے، بلکہ مومن کے امتیاز فن نے اس بزم علم و کمال میں آسمان سے تارے توڑ کر بکھیر دیے۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ مومن خاں نے شاعری کا آغاز بچپن ہی سے کر دیا تھا اور جب شعر کہنے لگے تو ابتدائی دور میں اپنا کلام مولوی اسماعیل اور شاہ نصیر کو دکھایا اور نام کی نسبت سے تخلص بھی مومن ہی اختیار کیا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

> ''شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور چمکا دیا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا، مگر چند روز کے بعد اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا'' (آب حیات، ص 423-24)۔

مومن خاں نے غزل کے علاوہ قصیدہ مثنوی، رباعی، قطعے اور ترکیب بند تضمین وغیرہ میں طبع آزمائی کی، لیکن طبیعت کا اصل رنگ ان کی غزل گوئی میں جا کر کھلتا ہے۔ ان کی مثنویاں بھی ان کے زمانے سے نرالی اور انوکھی ہیں۔ ان میں قصہ، ماجرا خیالی اور تصوراتی ہونے کے بجائے خود اپنی آپ بیتی ہے جو ایک طرح سے ان کی خود نوشت سوانح کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے عشق کے چرچوں کے راز کھولتی ہیں۔

مومن نے جو شاعری کی وہ اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کی تشفی کی خاطر کی، انھوں نے کبھی

کسی معاش کی خاطر شاعری نہیں کی اور نہ ہی کسی کو خوش کرنے کے لیے قصیدہ لکھا، جوان کی خوددار طبیعت کے خلاف تھا۔ مومن خاں کو اپنی شاعری پر اس قدر فخر تھا کہ اپنے عہد کے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جعفر علی خاں اثر نے لکھا ہے کہ:

"وہ اپنے معاصرین کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بار بار انھوں نے ان کو "سگانِ جیفہ خوار" لکھا ہے۔ وہ ذوق اور غالب کو اپنے مدمقابل گوارا نہیں کرتے تھے"۔

خود مومن خاں نے ایک غزل میں کہا ہے کہ ۔

مردوں پہ تجھ کو دیتے ہیں ترجیح جو حسود
مومن یہ جان لے کہ سگِ جیفہ خوار ہیں

اور حقیقت میں کئی طرح سے مومن خاں کے سامنے ان کی حیثیت کچھ نہ تھی، نہ معاشی نہ معاشرتی، نہ خاندانی، کیونکہ ذوق ایک مزدور کے بیٹے تھے، اور غالب ایک معمولی سپاہی کی اولاد تھے۔ مومن خاں شاہی اطباء کے خاندان سے تھے۔ اس لیے اعلیٰ وارفع درجے کی سوسائٹی سے تعلق رکھتے اور عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، غالب جس شاہی دربار میں جگہ پانے کے لیے بیقرار تھے، وہاں مومن خاں پہلے ہی سے نہ صرف براجمان تھے، بلکہ باقاعدہ ایک مقام رکھتے تھے۔ اسی لیے مومن خاں کو اپنی سماجی اور علمی حیثیت کی برتری کا احساس تھا۔ وہ اپنا مقابلہ فارسی کے بلند پایہ شاعروں سے کرتے تھے، جس کا تذکرہ انھوں نے قطعات، غزلیات اور مثنویات وقصائد میں بھی کیا ہے۔

یہاں میں بطور خاص عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر ہم مومن کے عہد کے ماحول پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مومن خاں کا زمانہ اردو شاعری کے زریں دور کا زمانہ تھا۔ اردو شاعری اس دور میں اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی اور امراء ورؤسا ونوابین اور شہزادوں نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ دہلی، خاص طور پر شعر وادب کے حوالے سے اسے مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جہاں میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر اثر، میر سوز اور مرزا سودا وغیرہ باکمال شعراء پیدا ہو چکے تھے۔ خود مومن خاں کے زمانے تک شعر وشاعری کا ماحول سرگرم تھا۔ اس دور کے علمی، ادبی اور شعری ماحول میں کم ازکم چار ایسے بڑے شاعر نظر آئے جنھیں اردو شاعری کا چار مینار کہا جاسکتا ہے اور چاروں

کے چاروں غزل کی دنیا میں ایسے ممتاز ونمایاں تھے جو اس صنف میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔یعنی مرزا محمد رفیع سودا، شیخ ابراہیم ذوق، مرزا اسداللہ خاں غالب، اور حکیم مومن خاں مومن۔لیکن ان چاروں میں خالص تغزل اور دنیا کے تجربات کا عاشقانہ رچاؤ جو مومن خاں کی شاعری میں نظر آتا ہے، وہ دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔مرزا محمد رفیع سودا کی غزلوں میں عشق کا خمیر ضرور ہے، لیکن اس کا جھکاؤ متصوفانہ اور عارفانہ ہے۔مومن کی غزلوں میں جو عشق ہے، وہ آب مصفّٰی سے دھلا ہوا نظر آتا ہے۔

ان کے یہاں عشق مجازی کی بے تکلفی اور دوٹوک اظہار نہیں ملتا۔جہاں تک مرزا غالب کی بات ہے تو ان کے اشعار میں ضرور حسن محبوب کا تذکرہ اور شوخی ہے لیکن یہ بھی شاید بعد میں نظر ثانی شدہ کلام میں آیا ہے کیونکہ جس زمانے میں مومن خاں باحیات تھے تو غالب بے حد ثقیل اور پرواز تخیل سے پرے کی شاعری کررہے تھے اور یوں بھی مومن خاں ان سے عمر میں کچھ بڑے تھے اور ذاتی مکافات وتحفظات کے مالک تھے۔اس لیے شاید مرزا غالب، جو اسد تخلص کرتے تھے، مومن سے مرعوب رہتے تھے۔مومن کی علمی لیاقت وشعری ذہانت کے وہ بھی قائل تھے اور ۱۲۴۵ھ میں غالب تخلص اختیار کر چکے تھے۔مومن خاں کی شاعری کی جس طرح قدر کرتے تھے، اس کا اندازہ یادگار غالب میں مذکور اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مرزا اسداللہ خاں غالب نے مومن کا یہ شعر پڑھا تو کہا کہ مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کو اس عہد کا سب سے بڑا عاشق مزاج شاعر مانا جاتا ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غالب نے بھی اپنے عہد کی روایات کی پاسداری کی ہے۔انھوں نے جو باتیں کہیں ہیں، ذرا پردے سے کہی ہیں۔مومن کے یہاں عشق مجازی کا انداز بالکل بے حجاب ہے۔میرے خیال میں سچائی تو یہ ہے کہ مومن خاں ہی وہ جرأت منداور باغیانہ ذہن رکھنے والا شاعر ہے، جس نے کسی رسوائی اور بدنامی کی پروا کیے بغیر جنس مخالف سے بے باکی کے ساتھ محبت کی اور اپنی شاعری میں اس محبت کا بے خوف وخطر اظہار بھی کیا۔انھیں اپنی محبت اور اپنی محبوبہ کی باتوں کے اظہار کا ذرا بھی خوف نہیں تھا، نہ گھر کا نہ خانقاہ کا اور نہ معاشرہ کا۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

مومن خاں مومن وہ شاعر ہے جس نے غزل کو اس کے اصلی اور لغوی معنوں میں استعمال کیا۔ انھوں نے اپنی محبوبہ یا معشوقہ کی تمام اداؤں کا ذکر کیا۔ ان کا محبوب خیالی نہیں، بلکہ اسی محلے، اسی گلی، اسی شہر، اسی زمانے اور ان ہی کی طرح اس دنیا کا باشندہ ہے۔ وہ بھی ان ہی کی طرح گوشت پوست اور خون کا بنا ہوا ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے، اس کے دل میں بھی محبت کا طوفان موجزن ہے۔ وہ کبھی روٹھتا ہے، کبھی منتا ہے کبھی چاہتا ہے، کبھی نفرت کرتا ہے۔ یعنی شاعرانہ لفظوں میں کبھی وصل ہے کبھی فراق ہے، کبھی وفا ہے، کبھی جفا ہے، کبھی رحم ہے کبھی ستم ہے غرض کہ زندگی کے سیکڑوں انداز ہیں جن کو مومن خاں نے مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ محبوب یا معشوق تو ایک ہی ہے، اس کے نخرے ہزار ہیں اور پھر شاعر کے دیکھنے اور اس کے برتنے اور شاعری میں اظہار کے نوع بہ نوع طریقے ہیں۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا

وہ ایک تھا، مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

غرض کہ محبت کے یہ مختلف اور معکوس رنگ مومن کی شاعری میں بڑی کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں، جن کے کئی رخ ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خیالات کا براہ راست اظہار اور ذاتی تجربات کا بیان مومن خاں کی شاعری کا دلکش پہلو ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ، رنج، راحت، محبت کی خاردار راہوں اور گل فشاں بہاروں کے تذکرے بھی ہیں اور یہ چیزیں خیالی اور قیاسی نہیں ہیں۔ بقول تنویز احمد علوی، ان کے محبوب کے پیکر ''صورت میں خیالی اور ہیئت میں مثالی'' ہیں۔ اس کی حیثیت دوستوں اور ہمجولیوں کی سی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مومن کے کلام پر سنجیدگی سے غور کرنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ چونکہ مومن خاں ایک جاگیردارانہ نظام کے زائیدہ فرد تھے اور ایک راسخ العقیدہ گھرانے کے پروردہ اور نظری اعتبار سے مطمئن تھے، یعنی اسرار کائنات سے انھیں خانقاہ اور گھریلو ماحول نے جس طرح آگاہ کیا تھا، وہ اس سے مطمئن تھے، اسی لیے ان کے یہاں فطرت کے چھپے ہوئے رازوں کو جاننے اور اس کے پوشیدہ پردوں کو اٹھانے کی جستجو نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں محض جانی پہچانی باتوں کا تذکرہ ملتا ہے جو محض ''خبر'' تک محدود ہے۔ یعنی ہم ان کی شاعری میں حیات و کائنات کے مسائل اور انسانی زندگی کے پیچ و خم کو ڈھونڈھتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہاتھ آتی

ہے۔البتہ مومن کی شاعری کے فنی لوازم پر نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک بڑے قادرالکلام شاعر ہیں اور شعر گوئی پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں، جن باتوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، بڑی خوبی اور آسانی سے ڈھال دیتے ہیں۔ان کے تمام تر کلام میں ان کی بحروں کی ساخت چھوٹی ہے۔یعنی چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑے آسان اور سادہ الفاظ میں بات ادا کر جاتے ہیں۔

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا
جی گیا یوں ہی رائگاں افسوس

☆☆☆

سید عینین علی حق

شرح کلام مومنؔ

دبستان دہلی کے حوالے سے گفتگو شروع کی جاتی ہے تو شاعروں کا ایک جم غفیر نظر آتا ہے، مگر اپنے وطن عزیز سے انتہا درجے کی محبت، قناعت پسندی، صبر وتحمل اور تصوف وطریقت کا شائبہ چند ہی شعرائے کرام کے یہاں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھیں شعرا میں 18 ویں صدی کے اوائل یعنی 1800 میں دہلی کے کوچہ چیلان میں پیدا ہونے والے اور زینے سے گر 21 مئی 1851 میں دنیائے فانی کو الوداع کہنے والے مومن خاں مومنؔ سرفہرست ہیں۔ مومن کی طبیعت میں خوشامد کے عناصر نہیں پائے جاتے کیوں کہ مومن ایک صوفی مشرب شاعر تھے۔ مومن کو میری سمجھ سے ان معنوں میں محدود کیا گیا کہ وہ عاشق مزاج شاعر قرار دیے گئے۔ آج ان کے فن کے حوالے سے گفتگو کم، مگر ان کی عشقیہ شاعری کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی جاتی ہے۔ جب کہ مومن کا کمال یہ بھی کم نہیں کہ اردو زبان میں لازوال غزلیں انھوں نے پیش کیں۔ مومن کی شاعری میں جنسی لذت کا اظہار ملتا ہے، مگر ان کے یہاں وہ توازن برقرار ہے جو دبستان لکھنؤ کے شعرا میں نہیں رہ سکا۔ وہ علمی زندگی کو ہی نہیں اپنی شاعری کو بھی عشق وعاشقی کے ارد گرد پیش کرتے ہیں۔ ان کے جد عہد مغلیہ میں کشمیر سے آئے اور طبیب کی حیثیت سے دربار میں داخل ہوئے، حکومت سے پرگنہ نارنول کی جاگیریں بھی حاصل کیں، مگر مومنؔ کے دادا حکیم نامدار خاں کی شرافت کا نواب فیض طلب خاں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ساری جائدادیں ضبط کرلیں۔

درباروں سے وابستگی کے باوجود مومن کے آباواجداد بزرگان دین کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے کہ ان پر سلاطین کے اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ مومن کے والد شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور انھیں اپنی زندگی کے لیے مشعل راہ

سمجھا کرتے تھے۔محدث دہلویؒ نے ہی مومن کی پیدائش پر ان کے کان میں صدائے اللہ اکبر پہنچائی اور ان کا نام مومن خاں تجویز کیا۔مومن نے اپنے نام کو ہی تخلص کے طور پر اختیار کیا۔ پیدائش سے لے کر آخری سفر تک یہ قرب قائم رہا۔مومن کی تدفین بھی محدث دہلوی کی درگاہ کے قریب ہوئی۔قدرت نے مومن کو بلا کی ذہانت دی تھی، جس کی بنیاد پر انھوں نے عربی وفارسی،علم طب،علم نجوم،موسیقی اور مختلف قسم کے کھیلوں پر بھی ید طولیٰ حاصل کیا۔اتنا ہی نہیں، اردو شاعری کی بات کی جائے تو مومن نے تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔مومن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے فن میں انفرادیت رکھتے ہیں، کسی کی نقل کا تصور ان کے یہاں نہیں ملتا۔حقیقت یہ ہے کہ اچھی شاعری، خصوصاً اعلیٰ درجے کا غزل گو شاعر ہونے کے لیے تصوف کی تعلیمات کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے تبھی غزل کے گیسو سنوارے جا سکتے ہیں۔مومن کے یہاں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جس کی بنیاد پر انھوں نے اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت،غزل، ترکیب بند،مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور حق بھی ادا کیا۔مومن کا ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہمارے درمیان موجود ہیں۔دہلی سے محبت کا عالم یہ تھا کہ پانچ دفعہ الوداع کہنے کی کوشش کی مگر وطن عزیز سے دور نہیں رہ سکے۔اسلاف کی تعلیم وتربیت نے انھیں خدا پرست اور متوکل بنا ڈالا تھا۔امرا وسلاطین سے بے حد نفرت کرتے اور انھیں ہیچ سمجھتے تھے۔ان کے دیگر ہم عصروں میں تو وظائف اور قصیدوں کے ذریعہ مال ومنفعت حاصل کرنے کی چاہت موجود نظر آتی ہے، مگر مومن نے اپنے ہاتھوں کو دراز نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے لیے قصیدوں کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔مومن اپنے موقف میں صاف تھے۔ان کے اندر ستائش اور صلے کی پروا نہیں تھی،ان کی بے نیازی نے انھیں شہرت دوام تک پہنچایا۔

دبستان دہلی کے شعرا میں یہ خصوصیات خواجہ میر درد کے بعد انہی میں دیکھی جا سکتی ہیں، جسے مومن کی انفرادیت اور خصوصیت قرار دینا ضروری ہے۔اپنی اسی انفرادیت کے سبب مومن دوسرے شعرا پر فوقیت لے جاتے ہیں۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مومن کے فن پر اس حد تک توجہ نہیں کی گئی جس طرز پر ان کے ہم عصروں غالب اور ذوق پر کی جاتی رہی ہے۔اردو ادب کی موجودہ صورت یہ ہے کہ نئے باب کا در وا نہیں کیا کرتے، بلکہ وہی غالب اور ذوق توجہ کا مرکز رہا کرتے ہیں۔مومن وہ شاعر ہیں جن

کے یہاں علوم کے جوار بھاٹے ٹھاٹیں مارتے ہیں۔ ان کی ایک انا یہ بھی تھی کہ وہ کسی کو اپنے مقابلے کا نہیں سمجھتے تھے جس کی وجہ سے سب کے غضب کا شکار رہے۔ اپنی شاعری میں بصیرت کا مظاہرہ نہیں کیا، جس طریقے سے غالب اور ذوق نے کیا۔ غالب اور ذوق سے مومن کا معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ذوق اور غالب نے تمام عمر شاعری محض داد و تحسین اور انعام و اکرام کے لیے کی اور مومن نے اپنے ذوق و شوق کی خاطر، اگر توجہ کی ہوتی تو ان کی شاعری میں غلطیاں در نہیں آتیں۔ بقول حسرت موہانی:

> ''جتنے اغلاط ان کے یہاں ہیں، کسی اور کے یہاں ہوتے تو اس کی زبان دانی اور استادی مشکوک ٹھہرتی، لیکن ان پر کوئی شک نہیں کرتا اور انھیں استاد تسلیم کرتا ہے''۔

دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ اکثر ہم عصروں میں انا کی جنگ جاری رہتی ہے اور کوئی بھی ایک دوسرے کے فن کا اعتراف کرنے کو راضی نہیں ہوتا، مگر مرزا غالب جیسے ہم عصر بھی 21 مئی 1852 انتقال کے بعد ہی سہی، اپنے دوست مومن کے اعتراف میں کہتے ہیں:

> ''یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی''۔

مومن کی شاعری نے کل بھی متاثر کیا تھا اور آج بھی کر رہی ہے۔ مومن نے شاعری کے خداؤں سے بھی اپنا اعتراف کرایا تھا۔ مومن اپنی حیات میں ہی باکمال شاعروں کی فہرست میں شمار کیے جاتے تھے۔ مرزا غالب نے مومن کی عظمت کا اعتراف محض ان کا ایک شعر لے کر اس کے عوض پورے دیوان دینے کی بات کہی تھی:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے ساتھ قدرت نے شروع سے تماشا کیا۔ ان کی تفہیم نہیں ہو سکی کیوں کہ مومن کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملا جو مکمل طور پر انھیں دنیائے ادب میں پیش کرتا اور شرح و تعبیر کے ذریعہ ان کی شاعری کو وسعت دے کر مستحکم بناتا۔ اس معاملے میں غالب اور ذوق مقدر کے دھنی ہیں۔ غالب کو حالی اور ذوق کو محمد حسین آزاد جیسا شاگرد نصیب ہوا۔ ان دونوں شاگردوں کی صورت حال سے بھی واقف ہیں۔ یہ اپنے اساتذہ کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آزاد کو تو ذوق کے

چیچک کے داغ بھی ستاروں کی مانند چمکتے نظر آتے ہیں۔آزاد نے تو مومن کی تضحیک یہاں تک کر ڈالی کہ مومن کوآب حیات کے پہلے ایڈیشن میں جگہ ہی نہیں دی اور بعد کی اشاعت میں شامل کیا جب کہ مومن آغاز میں ہی ذکر کے مستحق تھے۔انتھک کوششوں کے باوجود بھی مومن کا قد کوتاہ نہیں ہوسکا اور غالب کے مدمقابل ہی کھڑے کیے جاتے رہے ہیں۔آج ہمارے درمیان مومن جس بھی حد تک ہیں، وہ اپنے ایک اکلوتے شاگرد شیفتہ کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں ورنہ غالب، اقبال وذوق کے دائرۂ کار سے کوئی نکلنا ہی نہیں چاہتا۔یہاں میں نے دوغزل کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱)

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق

محبت وہ شے ہے جس کی چاشنی سبھی کو اچھی لگتی ہے۔لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس میں بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں غضب، انصافیوں اور زندگی کے خاتمے کے سوا کچھ نہیں ملتا، اس کے باوجود عشق کو عبادت جان کر ادائیگی ضروری سمجھی جاتی ہے۔دوسرے مصرعے میں عشق کے ساتھ بری بلا کا استعمال لاجواب ہے جس سے عشق کی عظمت میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

یہ معرکہ کا شعر ہے اور اس طرح کا شعر صرف مومن ہی کہہ سکتے ہیں۔مؤمن کی یہی خوبی انھیں دوسرے شاعروں سے منفرد کرتی ہے۔مومن کہتے ہیں اثرِغم ذرا بتادینا۔سوال ہے کہ غم کا اثر کس کو بتانے کی ضرورت ہے اور غم کا اثر ہوتا کیا ہے۔عشق ایک ایسا افسانہ ہے جہاں مسرت کم اور درد زیادہ ہے۔مومن حسن کی ان کیفیات سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس خوبصورت شعر میں مزے کا پہلو یہ ہے کہ مومن چاہتے ہیں کہ اثرغم کی شناخت ہونے پر یہ سلسلۂ عشق رواں رہے۔

آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آچھپا ہے عشق

قاعدے سے غور کریں تو مؤمن کے کئی اشعار روحانیت اور تصوف کی طرف اشارہ کرتے

ہیں۔ کچھ شعر معنویت کے اعتبار سے عشق کے سرد وگرم موسم کی آمیزش کو پیش کرتے ہیں۔ عشق خاموشی سے دستک دیتا ہے، اتنی خاموشی سے کہ کبھی عاشق کو اس کا یقین بھی نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی پردہ نشیں ہے یا محض مومن کے تخیل کی پرواز۔ مومن کی شاعرانہ کیفیات کا جواب نہیں۔

بوالہوس اور لاف جانبازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

مومن اس بات سے ناراض ہیں کہ عاشقوں نے محبت کی گہرائی کو سمجھا ہی نہیں۔ محبت ایک فنا ہو جانے والی کیفیت ہے اور کیفیت سے سرشاری کا جو رشتہ ہے، وہی اس کا حصہ ہے۔ مومن اس بات سے نالاں ہیں کہ بدلتے ہوئے وقت میں محبت اور عشق کے مفہوم کھوتے جا رہے ہیں۔ بوالہوس کی تعداد زیادہ اور عشق کھیل بن گیا ہے۔ خودستائی کرنے والے اور طمع رکھنے والے دلیروں نے کیا عشق کو تماشا اور کھیل سمجھ لیا ہے۔

وصل میں احتمال شادیِ مرگ
چارہ گر درد بے وفا ہے عشق

مومن کبھی کبھی غالب کی طرح الجھی ہوئی باتیں کرتے ہیں۔ اس شعر میں بھی یہ الجھاؤ برقرار ہے۔ عشق آشنا ہے جیسے دشمن ہوتے ہیں اور دشمنوں سے اکثر بے وفائی کی امید ہی کی جاتی ہے۔ دشمن تکلیف ہی پہنچاتے ہیں اور عشق بھی تکلیف پہنچاتا ہے، مگر دشمنوں کی تکلیف اس طرح اثر نہیں کرتی جیسی تکلیف عشق پر ہوتی ہے۔ مومن اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عشق لا علاج مرض ہے۔ وصل میسر نہ ہو تو پریشانی اور میسر ہو جائے تو موت کا احتمال ہوتا ہے۔ وصل کی کیفیات کو برداشت کرنا بھی ہر کے بس کی بات نہیں۔

سوجھے کیوں کر فریب دلداری
دشمن آشنا نما ہے عشق

اس شعر کی کیفیت وہی ہے جو مندرجہ بالا شعر کی ہے۔ بلکہ یہ شعر اس خیال کو وسعت دیتا نظر آتا ہے۔ اس میں مومن کہتے ہیں کہ دغا اور غداری کا تصور ممکن ہی نہیں کیوں کہ دشمن کوئی غیر تو نہیں بلکہ اپنا ہے، جسے ہم نے خود سے زیادہ چاہا اور سمجھا ہے۔

کس ملاحت سرشت کو چاہا

تلخ کامی پہ بامزا ہے عشق

یہ شعر بھی عجب کیفیت کا ہے۔عشق کے مختلف مراحل ہیں۔یہ مرحلہ پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔کبھی محبوب کی کوئی بات پیاری لگتی ہے، کبھی کسی بات پر گلہ نظر آتا ہے۔چاہتوں کی ناکامی بھی مزہ دے جاتی ہے۔لیکن محبوب کی ہرادا مومن کو پیاری ہے۔

ہم کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دل رُبا حسن و جاں رہا ہے عشق

عشق وہ شے ہے، جسے مومن دلبراور معشوق سے تعبیر کررہے ہیں۔جس کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں اور عشق تمام ترجیحات میں ایک اہم توجہ کا مرکز ہے۔

دیکھ حالت مری کہیں کافر
نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

میری حالت عشق کے چکر میں غیر ہو چکی ہے، اور میرے پریشان کن حالات کو دیکھ کر کافر بھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ بے وقوف تم نے دوزخ کا نام عشق رکھ دیا ہے، جس نے تمھاری حالت کو جہنم بنادیا ہے۔

دیکھیے کس جگہ ڈبو دے گا
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

مومن اس بات سے آگاہ ہیں کہ اکثر عشق میں ڈوبنے کی منزل آجاتی ہے۔آگ کا دریا ہے ڈوب کے جانے کے مترادف۔لیکن اس ڈوبنے کے احساس سے بھی زندگی کو ملال نہیں کیوں کہ سچا عاشق ان باتوں پر کان نہیں دھرتا۔

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے
باوفا حسن و بے وفا ہے عشق

یہاں مومن اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ حسن تو باوفا ہے۔لیکن عشق بے وفا۔کیوں کہ صدیوں سے عشق کی یہی کیفیت رہی ہے۔وہ عشق کی اس کیفیت کو جانتے ہوئے بھی مطمئن ہیں۔ اس شعر میں مومن نے حسن وعشق کو ترازو کے الگ الگ پلڑوں پر رکھا ہے۔

میں وہ مجنون وحشت آرا ہوں

نام سے میرے بھاگتا ہے عشق

یہ شعر بالکل منفرد کیفیت کا ہے۔ خود کو وحشت آرا مجنوں کہتے ہیں۔ اور میرا قد عشق سے بہت اوپر پرواز کر چکا ہے۔ عشق کے اثرات لاحق نہیں ہو سکتے، بلکہ عشق تو میرے نام سے بھی بھاگتا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے ماسوا ہے۔ مومن عشق کا دوسرا نام ہے۔ اس طرح کی دلچسپ باتیں مومن کی اکثر و بیشتر غزلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا دیا ہے عشق

مومن اس بات سے نالاں ہیں کہ عشق پر جان دینے کے باوجود کسی کو کچھ نہیں ملا۔ قیس و فرہاد اور وامق و مومن سب مر گئے۔ عشق کی راہ دشوار میں چاک گریبانی کے سوا کسی کو کچھ نہیں ملا۔ جو قیس و فرہاد کے ساتھ ہوا، وہی وامق اور مومن کے ساتھ بھی ہوا۔ مومن یہ کہہ رہے ہیں کہ میری سانسیں تو چل رہی ہیں، مگر دراصل میں معطل ہو چکا ہوں۔ دراصل یہ اشعار عشق کے مختلف رنگوں کے افسانے کو بیان کرتے ہیں۔

(۲)

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اس شعر کی خوبصورتی دو لفظوں میں پوشیدہ ہے اور مومن نے وہ دونوں الفاظ مصرعۂ ثانی میں استعمال کیے ہیں۔ وہ الفاظ ہیں ''ناچار'' اور ''جی''۔ پہلا مصرعہ راہ عشق کی عمومی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ عاشق، زندگی میں ہر قدم پر محبوب کے ہاتھوں سے فریب کھانے کے بعد یہ ٹھان لیتا ہے کہ اب زندگی میں آئندہ کسی سے نہیں ملے گا۔ ٹھان لینا بمعنی پختہ ارادہ کر لینا، عزم، عہد کر لینا۔ جب انسان کوئی بات دل میں ٹھان لیتا ہے تو پھر اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ چوٹ کی شدت کا اندازہ لفظ 'کسی' سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ عاشق اتنا مضطرب ہے کہ وہ کسی سے بھی آئندہ کوئی رسم و راہ رکھنے کو تیار دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن مصرعۂ ثانی میں وہی عزم، وہی عہد پاش پاش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کا بنیادی سبب، دل کی لاچاری ہے۔ مومن نے دل کو 'جی' کے معنی میں استعمال کیا ہے، اور اس

لفظ سے جان، سانس، زندگی، طبیعت، محبت وغیرہ مفہوم مراد لیے ہیں۔ ناچار کے معنی عاجز، لاچار، مجبور، مفلس محتاج وغیرہ ہیں۔ پہلے مصرعہ میں کیفیت اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں محض دل کی ناچاری کے سبب صورت حال کے بالکل تبدیل ہوجانے کا واضح اشارہ پیش کرتی ہے۔ ''پر کیا کریں'' کے ٹکڑے میں ایسی معصومیت پوشیدہ ہے، جو حالات کی سنگینی اور مجبوری کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ظاہر کررہی ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر مطلع ثانی ہے:

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

منہ دیکھ دیکھ رونا محاورہ ہے، یعنی روتے ہوئے حیرانی سے دوسروں کا منہ تکنا۔ بے کسی کا مطلب ہے، اکیلاپن، بے مددگاری، عاجزی، لاچاری وغیرہ۔ دردوغم میں ڈوبے ہوئے عاشق کی بے تابیوں اور بے چینیوں کا بیان اس شعر میں مومن نے کیا ہے۔ عشق کی راہ میں چلتے ہوئے عاشق کی زندگی اتنی کرب انگیز ہوگئی ہے کہ زندگی کی ہنسی خوشی کا تصور ہی ملیا میٹ ہو چکا ہے۔ مسرت اور انبساط کی کیفیت قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ عاشق کی زندگی میں ہر طرف اداسی اور محرومی ہے، ایسے میں عاشق کسی دوسرے کے چہرے پر ہنسی دیکھتا ہے تو اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے، اور وہ حیرت سے لوگوں کا منہ تکنے لگتا ہے اور پھر اگلے پل آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑتا ہے۔ ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر اس طرح پھوٹ کر رونا، اور خاص کر بے کسی کے عالم میں صورت حال کو مزید سنگین بنا دیتا ہے۔ اکیلے پن اور لاچاری کی یہ اذیت ہمارے دل میں عاشق کے تئیں ہمدردی کو جنم دیتی ہے۔

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

اے محبوب ہم تیرے عاشقِ صادق ہیں اور تو ہم سے ہی بات چیت نہیں کرتا، آخر تو ہی بتا تیرے اس رویہ کو ہم کیا نام دیں۔ تو ہی انصاف کر، ہم تجھ سے ہی جواب طلب کرتے ہیں کہ اس بے التفاتی کی کیا وجہ ہے، جب کہ ہم نے تجھے چاہنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ پھر کیوں تو ہم سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔

بیزار جاں سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

مومن اس شعر میں گلے شکوئے کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مجھ پر بیزاری کی حالت طاری ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم مدعی سے گواہ طلب کرتے۔ مومن کی تمام غزلیں عشق وعاشقی سے شرابور نظر آتی ہیں۔ان کا یہ مصرعہ بھی معشوق سے گفتگو ہے۔ بیزار کے مختلف معنی بھی برآمد ہورہے ہیں، جس سے مختلف تناظر میں سوچا اور سمجھا بھی جاسکتا ہے۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا
لو بندگی، کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

مومن نے اس شعر میں رعایت لفظی کو بڑی فن کاری کے ساتھ برتا ہے۔ پہلے مصرے میں صاحب کے معنی مالک اور اس کی رعایت سے غلام اور پھر غلام کے تعلق سے زندگی اور ''آزاد'' کے تعلق سے ''بندگی سے چھوٹ جانے کا''۔صاحب، غلام اور زندگی اس شعر کے کلیدی الفاظ ہیں۔ غلام کے معنی 'بندے' کے ہوں گے۔اس صورت میں شعر کا مفہوم سفر آخرت سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا، یعنی مالک حقیقی نے بندے کو تمام طرح کی آزمائشوں سے نجات دے دی۔ گویا زندگی کا سفر ختم ہوگیا تو بندگی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ یعنی حساب کتاب کے سارے دفتر بھی بند ہوگئے۔ ''صاحب'' یعنی محبوب نے اس غلام یعنی عاشق کو اگر اپنی بندگی سے آزاد کردیا، یعنی اپنے سارے رشتے منقطع کر لیے تو یہ قدم بھی عاشق کے لیے کسی افسوس کا باعث نہیں، بلکہ غلامی سے نجات حاصل کرنے اور آزادی کی فضا میں سانس لے کر وہ ذہنی طور پر خود بھی فرحت محسوس کررہا ہے۔ بندگی سے چھوٹنے پر وہ ایک طرح کی ذمہ داری سے نجات حاصل کرنے کا بیان کررہا ہے۔'لو بندگی' یعنی اپنی ذمہ داری، وہ خوشی سے کسی اور کو سونپنے کے لیے راضی ہے اور اس عمل میں پچھتاوے کے بجائے اسے ذہنی سکون کی دولت میسر ہے۔

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل
کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

مومن کا یہ مصرعہ شوخی سے شرابور نظر آتا ہے۔اس میں رنج وملال کی باتیں ہورہی ہیں اور کہا جارہا ہے کہ غصے کا عالم یہ تھا کہ گھٹا اب تک باقی ہے۔ اگر یہ رنج وملال ختم ہوجاتا تو ہم انھیں

مذاق سے آسمانی ہنسی کہا کرتے تھے۔ یہاں مومن نے رونے کو ابر سے تشبیہ دی ہے۔

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

مومن کے یہاں بہترین لفظیات کا استعمال بہت ہی خوب صورتی سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ مومن نے اس مصرعے میں بھی وہ الفاظ پیش کیے ہیں جو نہایت ہی سلیس قرار دیے جاسکتے ہیں۔ مومن اردو کے ہی وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مکمل طور پر اردو میں مستعار لیے گئے ہیں۔ اس شعر میں مومن نے حاسدین کو نشانہ بنایا ہے۔ شعر کا مفہوم یہی واضح کرتا ہے کہ ہمارا دیارِ معشوق سے نکالا جانا یقینی تھا، چوں کہ ہم رقیب کی راہ کا روڑا بنے ہوئے تھے۔

کیا گل کھلے گا دیکھیے، ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

اس شعر میں شاعر صنعتِ تجنیس سے کام لیتا ہے (یعنی دو جگہ 'گل' استعمال ہوا ہے جو تلفظ میں یکساں ہیں، لیکن معنی میں مختلف ہیں) کہتے ہیں ابھی بہار کا موسم دور ہے لیکن ہمیں سودا ہونے لگا ہے یعنی ہم پر ابھی سے دیوانگی طاری ہو چلی ہے۔ اس دیوانگی میں ہم کپڑے پھاڑ کر جنگل کا رخ کرتے ہیں۔ بہار آنے سے قبل ہماری یہ کیفیت ہے تو بہار آنے کے بعد ہمارا کیا انجام ہوگا، یعنی بہار کے موسم میں ہماری حالت کے اور زیادہ خراب ہونے کا امکان ہے۔

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

اس میں شاعر کہتا ہے کہ وہ میری شکل دیکھنے سے قبل بھی کب ساتھ تھے جو ہم بے وجہ رنج وملال کریں، وہ بھی آئینہ سے۔

ہے چھیڑا اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

پیار محبت اخوت بھائی چارگی کا پیغام صرف اپنوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ غیر کے سامنے پیش کیا، مگر ہنس تو سکتا نہیں، رونا پڑسکتا ہے۔

وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا

منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشم پری سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

متضاد الفاظ نے شعر میں اپنا جادو جگایا ہے اور شعر کی معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ پہلے مصرعے میں بیگانہ کے ساتھ ہی آشنا کا ذکر ہے۔ 'بیگانہ آشنا' کی یہ ترکیب متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی، کیونکہ یہ ترکیب انوکھی بھی ہے اور اس میں معنی کی متعدد جہتیں بھی شامل ہیں اور پھر ایسی ترکیب کی مناسبت سے مصرعہ ثانی میں اپنے کے ساتھ اجنبی کا ذکر ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق تذبذب کا شکار ہے۔ وہ اپنے دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سمجھ پانے سے قاصر ہے۔ جسمانی طور پر وہ کسی مخصوص مقام پر موجود تو ہوتا ہے لیکن ذہنی طور پر کسی دوسری ہی دنیا کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ ''بیگانہ آشنا'' یقیناً محبوب ہے، جو عاشق کو بہ یک وقت دو متضاد کیفیتوں سے دوچار کرتا ہے، ''آشنا'' کے ساتھ ہی ''بیگانہ'' لفظ کا استعمال کر کے شاعر نے محبوب کے دوسرے رخ کو بھی پیش کردیا ہے۔ ہزار آشنائی کے باوجود قدم قدم پر محبوب کی ادائیں اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ بیگانگی کا احساس بھی بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ تمام تر بے اعتنائیاں، محبوب صرف اس بنا پر کرتا ہے تاکہ اس کی اداؤں میں مزید نکھار پیدا ہو سکے۔ عاشق سے اس کا تعلق بہت پرانا نہیں ہے۔ اسی بنا پر عاشق سے وہ بیگانہ نہیں لیکن ساتھ ہی پوری طرح آشنا بھی نہیں۔

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مومن یعنی ایمان لانے والا، مذہب اسلام کا پیروکار، جب کہ بدعتی ٹھیک اس کے متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مذہب میں نیا طریقہ نکالنے والا، بڑی رسم جاری کرنے والا، فساد پھیلانے والا، وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مومن اور بدعتی دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جو مومن نہیں ہے وہ بدعتی ہے، اس کے اندر مومن کے صفات موجود نہیں ہو سکتے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے عاشق کے جوش اور ولولے کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہاں لفظ آرزو اپنے اندر معنی کی متعدد جہتیں رکھتا ہے۔ اس لفظ کے ذریعہ خواہش کے ذریعہ، خواہش تمنا، چاہ، مراد، مقصد، مطلب وغیرہ مفاہیم کی ترسیل ایک ساتھ ہو رہی ہے۔ ایک مومن غلط راستوں کا استعمال کبھی نہیں کر سکتا۔ جن

چیزوں کا تعلق بدعت سے، ہے وہ چیزیں مومن کے ذریعے انجام نہیں پاسکتیں۔ شاعر واضح طور پر کہتا ہے کہ اگر بدعتی سے ہم کوئی ربط رکھیں، بدعتی سے ہمارا کوئی تعلق ہو، تو پھر ہم مومن نہیں ہوسکتے۔ مومن لفظ کا لغوی مفہوم شعر میں ندرت پیدا کررہا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے تخلص کا دوطرفہ استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

☆☆☆

مومن

مومن خان مومن اردو کے عہد زریں کے ان اہم شاعروں میں ہیں جو ایک طرف روحانی اور دینی میدان کے شہسوار تھے تو دوسری طرف عشق ومحبت کی راہ میں خود کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مضامین مشکل ضرور تھے لیکن اہل نظر اہل شاعروں سے دنیاوی علوم میں ان کا درک مخفی نہیں تھا۔ وہ حضرات ابراہیم ذوق اور مرزا غالب کے ہم عصروں میں تھے۔ مرزا غالب، مومن کی سادگی پر اپنا پورا دیوان لٹانے کو تیار تھے۔

مومن ۱۲۱۵ میں دہلی کے محلّہ کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے، مومن کی پرورش وپرداخت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو دینی وعلمی روایت سے وابستہ تھا اور ولی اللہی کا معتقد تھا۔ مومن کے آباء، شرفائے کشمیر سے تھے اور دہلی آکر آباد ہو گئے تھے۔ خاندانی پیشہ طبابت ہونے کی وجہ سے شاہی دربار میں بڑی وقعت تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے مومن کے گھرانے کی بڑی انسیت تھی، چنانچہ جب ہوش سنبھالا تو حضرت شاہ عبدالقادر کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اپنے خاندانی پیشہ طبابت کی تعلیم لی۔ اس کے ساتھ ساتھ علم نجوم اور ہیئت میں بھی کمال درک بہم پہنچائی۔ اس کے علاوہ ریاضی، موسیقی، رمل، جفر، شطرنج اور چوسر میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔

مومن چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنا دیوان ایسی غزل سے شروع کیا جس میں حمد، نعت، منقبت اور جذبہ اعلائے پرچم اسلام شامل ہے۔ ان کے دیوان کا سب سے پہلا شعر ہے۔

نہ کیوں کر مطلع دیواں ہو مطلع مہر وحدت کا
کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشت شہادت کا

اس شعر میں انھوں نے وحدانیت کا اشارہ کیا ہے اور توحید کو پھیلانے کے لیے اپنے عزم کا

بھی اظہار کیا ہے۔انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ دیوان کا یہ مطلع توحید کے سورج کا مشرق بن جائے اور ان دیوان کے ذریعے پوری دنیا میں توحید کا اجالا پھیلے۔

بچاؤں آبلہ کو کیوں کر خار ماہی سے ۔۔۔ کہ بام عرش ہے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا
سرشک اعتراف عجز نے الماس ریزی کی ۔۔۔ جگر صد پارہ ہے اندیشہ خوں گشتہ طاقت کا
نہ یہ دست جنوں ہے اور نہ یہ جیب جنوں کیشاں ۔۔۔ کہ ہو دست مژہ سے چاک پردہ چشم حیرت کا
غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے ۔۔۔ نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

مومن نے اپنے دیوان کی پہلی غزل کے پہلے چھ مصرعوں میں حمد باری تعالیٰ، معرفت خداوندی سے اپنے عجز کا اظہار، معرفت خداوندی کی کی شدید خواہش، اللہ جل شانہ کی جلالت کے سامنے اظہار شرمندگی، اللہ کی قہاری وجباری سے خوف ودہشت اور اس کی رضا وخوشنودی کے حصول کی چاہت کے ساتھ ساتھ اس خلوص ومحبت کا کا اظہار کیا ہے کہ اے اللہ مجھے تیری جنت کی چاہت یا دوزخ کا خوف نہیں ہے، بس مجھے صرف اور صرف تیری رضا چاہیے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پاک تمام شاعروں نے لکھی ہے اور آداب میں شامل ہے کہ حمد باری تعالیٰ کے بعد حضور کی مدح بیان کی جائے۔ چنانچہ مومن نے بھی حمد کے نعت پاک کے چند اشعار لکھے ہیں۔

گلوئے خامہ میں سرمہ مداوا دودۂ دل ہے ۔۔۔ مگر لکھنا ہے وصف خاتم جلد رسالت کا
نہ پوچھو گرمی شوق ثنا کی آتش افروزی ۔۔۔ بنا جانا ہے دست عجز شعلہ شمع فکرت کا
نمک تھا کہ بخت شور فکر خوان مدح شیریں پر ۔۔۔ کہ دندان شمع نے خوں کیا ہے دست حسرت کا

ان تینوں اشعار میں مومن نے حضور کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کا خراج کئی شکلوں میں پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ قلم سے جو سیاہی نکل رہی ہے وہ میرے دل کی ناکامی کا دھواں ہے اور ناکامی سے میرا دل ڈوب چکا ہے لیکن خاتم المرسلین محمد ﷺ کی توصیف لکھنے سے میرے اس قلم اور دل کو تسکین ملے گی۔ کیوں کہ حضور کی ستودہ والا صفات کی تعریف کے بغیر دل کو قرار نہیں آ سکتا۔ مومن حضور کی شان میں نعت گوئی کے لیے اتنے پُر شوق ہیں کہ ان کا دل وفور نعت سے لبریز ہو کر اب عجز

کا اظہار کرنے لگا ہے۔ گویا وہ کہتے ہیں کہ یارسول اللہ آپ کی ذات بہت ہی اعلیٰ ہے۔ میری محدود فکر آپ کی وسعت شان کا اندازہ نہیں لگا سکتی اور میری گندی زبان آپ کی ذات والا صفات کے ذکر کے قابل نہیں۔ گویا وہ مولائے روم کے اس شعر کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اس غزل کے بقیہ نعتیہ اشعار میں مومن نے اسلام کے پرچم کو بلند کرنے اور توحید کے پیغام کو عام کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مومن چونکہ ایسے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کو ازبر کرایا گیا تھا کہ دعا کرنے سے پہلے باری تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول مقبول ﷺ کی نعت اور درود پڑھی جائے تو وہ دعا رد نہیں ہوتی، اس لیے انھوں نے اپنے آنے والے شعر میں یقین کامل کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اب میں اپنے رب سے کیوں نہ دعا کروں کہ یہی تو قبولیت دعا کی گھڑی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

خدایا ہاتھ اٹھا عرض مطلب تھا کیوں کر
کہ ہے دست دعا میں گوشہ دامان اجابت کا

پرچم توحید کی سربلندی کا ایک جنون ان کے اندر تھا جو ان کے فروغ توحید کے زمام شوق کو مہمیز کر رہا تھا۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ دنیا میں صرف خدا کی پوجا کی جائے اور گمرہی وضلالت اس دنیا سے ختم ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے سخت تیور اپناتے ہوئے دعا کی ہے کہ اے اللہ توحید کو اس قدر غالب فرما کہ جاہلیت اور گمرہی کا خرمن ہستی تباہ وبرباد ہو جائے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

فروغ جلوہ توحید کو وہ برق جولاں کر کہ خرمن پھونک دیوے، ہستی اہل ضلالت کا

مومن نے اپنی اس دعائیہ، حمدیہ اور نعتیہ غزل میں اللہ سے دعا کی ہے کہ مجھے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی سیرت طیبہ پر گامزن فرما، تاکہ میرا ویران دل سنت رسول سے آباد ہو جائے۔ مومن چونکہ دینی علوم پر کامل عبور رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا قرآن واحادیث کی بھی ترجمانی کی ہے۔ ماسبق میں پیش کیے گئے کئی اشعار میں قرآن واحادیث کے پیغامات کی جھلک ملتی ہے۔ مومن نے اپنی حمدیہ اور مدحیہ غزل میں حضور کی اس حدیث کی بھی تشریح پیش کی ہے جس میں حضور نے وصیت کی ہے کہ میری امت میں جو شخص امام مہدی کا زمانہ پائے تو

اس کو میرا اسلام کہہ دے۔ امام مہدی علیہ السلام قرب قیامت ظاہر ہوں گے اور لوگوں کو فتنہ دجال سے نجات دلائیں گے۔ مومن کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا جوہر ہو سرتاپا صفائے مہر پیغمبر — میرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو — دل صد پارہ اصحاب نفاق اہل بدعت کا
خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا — لبوں پر دم بنا ہے جوش خوں شوق شہادت کا
نہ رکھ بیگانہ مہر امام اقتداء سنت سے — کہ انکار آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا
اسیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی — ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن — تو سب سے پہلے کہوں سلام پاک حضرت کا

مومن کے اس جداگانہ مضامین اور رنگ تغزل کی وجہ سے ہی ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی اس قدر گہری مذہبی فکر کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت خاندان ولّلہی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجلس وعظ میں انھیں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کبھی کبھی دوسرے مسالک کی چٹکیاں بھی لیا کرتے تھے لیکن بزرگان دین، صوفیہ اور اہل خانقاہ سے ان کی محبت مسلّم ہے۔

مومن ایک طرف تو مذہب اسلام کے تئیں جس جذبہ، ولولہ اور شوق کا اظہار کیا ہے، اسی طرح دوسرے اشعار میں عشق ومحبت، معشوق کی عشوہ طرازی، ناز وادا اور خودسپردگی کا ذکر کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
کچھ جی گرا پڑے پر اب تو نے ناز سے — مجھ کو گرا دیا تو میرا دل سنبھل گیا

ان اشعار میں مومن نے اپنے محبوب کی محبت میں اپنے اندرونی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے محبوب کی گلی کی ہوا کو زخم پر نمک چھڑ کنے کے مترادف بتایا اور کہا کہ اس کی وجہ سے میرے سارے زخم ہرے اور تازہ ہو گئے۔ ماسبق میں مومن نے جنت کے شوق اور دوزخ کی ہولناکی کے بجائے اللہ کی رضا وخوشنودی کو اپنے لیے اولین ترجیح دی ہے لیکن مومن کا یہ شعر بھی دیکھیے۔

اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا　　نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا

اور یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے۔

نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا　　غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے

مومن کے اشعار میں کئی مقامات پر تضادات نظر آتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی سخت گیر مذہب پسند رہے تو کبھی دل سوختہ دل گرفتہ عاشق زار، اس لیے مومن کی شاعری میں متضاد چیزیں درآئی ہیں۔ مومن کے یہاں طنز و مزاح کا عنصر بھی جگہ جگہ غالب نظر آتا ہے، مسلکی معاملات ہوں یا حسن و عشق کا تذکرہ، ہر جگہ ان کی ظرافت کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے محبوب پر بھی طنز کر دیا ہے جس نے اپنے بیمار عاشق پر بھی رحم نہیں کیا۔ شعر دیکھیے۔

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ وہ ہے　　غیر عیادت سے برا مانتے رہے

محبّ حسین کا ہے اور دل رکھے شمر کا سا　　قتل کیا آن کے اچھا کیا

مومن اپنے عشق کو کسی سے نہیں چھپاتے بلکہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں، عشق ان کے لیے حرز جاں ہے اور ان میں وہ خود کو فنا کر لینے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے۔

ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا　　دم حساب رہا روز حشر بھی یہی ذکر

مومن یوں تو تمام صنف شاعری پر عبور رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اظہار خیال کا ذریعہ صرف صنف غزل کو بنایا۔ انھوں نے کئی علوم پر کامل دستگاہ ہونے کے باوجود صرف حسن و عشق، ہجر و وصال، معشوق کی ناز برداری اور عشقیات کے اردگرد خود کو محدود کر لیا لیکن اس کے باوجود اُن کے یہاں بلا کی سنجیدگی اور معنی کی گہرائی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر اور خود کو فنا کر کے بھی اپنے محبوب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مرض الموت کے عالم میں جب تمام اقرباء انھیں کلمہ طیبہ پڑھنے کی تلقین کر رہے ہیں، اس وقت بھی انھیں اپنے معشوق کی یاد ستاتی ہے۔ مومن کا شعر دیکھیے۔

ہزار شکر کہ اس دم وہ بد گماں نہ ہوا　　خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب

دبستان دہلی کے دیگر شعراء کی طرح مومن کے یہاں بھی داخلی کیفیت کا اظہار اکثر مقام

پر ہوا ہے۔ چونکہ مومن بھی دہلی میں ہونے والی اتھل پتھل سے دل برداشتہ تھے اور انگریزوں کے خلاف برسر پیکار رہنے والے گروپ کے ہمنوا تھے اس لیے ان کے یہاں جذبات کی شدت کا احساس کثرت سے ہوتا ہے۔ وہ جس پایہ کے عالم تھے اگر ان تمام علوم پر اظہار خیال کرتے تو شاید ان کا شمار عظیم شاعروں میں ہوتا لیکن وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف حسن وعشق اور محبوب کی عشوہ طرازی وناز برداری کو اختیار کیا۔ وہ اس دنیا میں صرف ۵۳ سال ہی زندہ رہے۔ مومن اپنے ہم عصروں میں مقبول بھی تھے اور ان کے ہم عصر ان کی قدر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو غالب نے ان کی یاد اور تعریف میں رباعی بھی لکھی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مومن نے عشق ومحبت کے موضوعات کو بڑے نفسیاتی انداز میں پیش کیا جس میں نزاکت اور کشش ہے۔ مومن کی زندگی کی دو متضاد کیفیات کی وجہ سے ان کی شاعری میں تضادات ضرور آ گئے ہیں لیکن مومن کے اشعار میں ان کے جذبات کی شدت اور خیال کی معنی آفرینی کو بھی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ مومن کی شاعری پر مولانا حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ، نزاکت خیالی میں مومن غالب سے سبقت لے گئے تھے، محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مومن کی تعریف یوں کی ہے، مومن کا علم ان کے ہم عصروں پر مسلّم ہے، ان کی نجوم دانی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، مجاہد انقلاب ۱۸۵۷ علامہ فضل حق خیر آبادی کہا کرتے تھے کہ ''مومن بھیڑیا ہے اس کو اپنی قوت کی خبر نہیں، اگر وہ عشق وعاشقی کے قصے کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی''۔

☆☆☆

مطبـــــوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
غالب اور آہنگ غالب	یوسف حسین خاں مرحوم	350/-
غالب اور منٹو	پروفیسر شمس الحق عثمانی	160/-
اقبال اور غالب کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خاں مرحوم	200/-
دیوان غالب (ہندی)	غالب اکیڈمی	100/-
دیوان غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	100/-
دیوان غالب ڈیلکس	غالب اکیڈمی	200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	300/-
دیوان غالب (شرح ہندی)	نسیم عباسی	550/-
مرزا غالب کا روزنامچہ	شمس العلماء خواجہ حسن نظامی	50/-
مومن شخصیت اور فن	ظہیر احمد صدیقی	300/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
جنوب ایشا میں رابطے کی زبان (انگریزی)	محمد حسن	75/-
رقص شرر	ان مری شمل/قاضی افضال حسین	90/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	75/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
غالب کی سوانح عمری خطوط کی روشنی میں	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	250/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
مزار غالب اردو	ڈاکٹر شمس بدایونی	100/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	شمیم حنفی	150/-
مزار غالب (ہندی)	شمس بدایونی	100/-
یادگار غالب (فارسی متن کا ترجمہ)	الطاف حسین حالی/نسیم عباسی	450/-
مرزا غالب ہند مغل جمالیات	شکیل الرحمٰن	400/-
غالب کی فارسی شاعری تعارف وتنقید	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	280/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
اردو نیچر	پروفیسر نصیر احمد خاں	60/-
اقبال مضامین ومقالات انگریزی	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
غالب اور بہادر شاہ ظفر 1857	شمیم طارق	60/-

Ghalib Academy, Basti Hazrat Nizamuddin, New Delhi